جب دیواریں گریہ کرتی ہیں

(افسانے)

الطاف فاطمہ

Aslam Mahmud
Fri., 26 Mar. 2004

جب دیواریں گریہ کرتی ہیں

الطاف فاطمہ

شہرزاد
SCHEHERZADE

اس کے ساتھ ہی بولیوں کا سلسلہ چل پڑتا۔

اس کے ساتھ ساتھ گلے شکوے اور نہ جانے کیسی کیسی باتیں چل پڑتیں اور گرہستیں نہ معلوم کس بنا پر منصفی کے فرائض اس کو سونپ دیتی تھیں۔ اور وہ تھا کہ ترازو، میزانِ عدل کی صورت ہاتھ میں پکڑے بیچ میں ثالثی بنا کھڑا ہے۔ ترازو کے ایک پلڑے میں خوش رنگ اور شاداب سبزی اور دوسرے میں پیتل اور لوہے کے ملے جلے باٹ اور خواتین کا پیہم اصرار!

اے بھیّا! اے بھائی! وے بھراوا تو ہی کہہ۔

میری جیسی نہ کہیو، خدالگتی بولیو، اپنے ایمان سے کہیو۔

اور وہ ہے کہ بول رہا ہے، خوب بولے چلا جا رہا ہے (پتا نہیں کوئی خدالگتی یا ایمان سے کہی بات اس کے منھ سے نکلتی بھی ہے کہ نہیں) بات یہ ہے کہ اس کو تو افواہوں، اسکینڈلوں، اعتراضوں اور گھروں سے نکل کر اس کے وسیلے سے گلی میں پہنچ جانے والے جھگڑوں قصّوں کا چسکا پڑ چکا ہے۔ شاید وہ اس گلی میں آتا ہی ہے اسی چسکے میں۔ اور اب میرا مورال کچھ کچھ ڈاؤن ہونے لگا ہے۔

ایک دم اسے کچھ یاد آتا ہے اور وہ لہک لہک کر آوازیں لگانے لگتا ہے۔

گوبھی لو، مونگرے لو، لے لو گاجر، لو...

ارے بھائی ہماری سبزی تو تول دو۔ میں اوپر سے آوازیں لگاتی ہوں تب جا کر اس کو ہوش سا آتا ہے۔

پر اس کی اس محویت، انہماک اور محلے کی پالیٹکس میں انوولومنٹ پر مجھے جھنجھلاہٹ بھی نہیں ہوتی اور میں بور بھی نہیں ہوتی۔

بات اصل یہ ہے کہ سائیکل کے کیریئر پر جمے ٹوکرے میں رکھی رنگ برنگ سبزیاں خود سبزی والا اور ٹوکریاں اور تھیلے سنبھالے خواتین کا انبوہ یہ سب کا سب پوری گلی کے تناظر میں، ایک بہت بڑا میورل محسوس ہوتا ہے۔ جسے کسی مشاق مصور نے ہلکے، گہرے، شوخ اور خاکستری رنگوں کے آمیزے سے تیار کیا ہو۔ اور یہ سب کچھ مجھے یوں

جانے دیں۔ میں چپ چاپ اس کی تنخواہ لائی، اس کا کرایہ دیا۔ وہ سامان اٹھانے گیا تو میں نے سنا، وہ دھیرے دھرے کہہ رہا تھا، ''مجھے اسلحہ نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔ دیکھا تھا تو سوال نہیں کرنا چاہیے تھے۔ عبداللہ اپنا ٹین کا بکس اور بستر اٹھائے روتا ہوا چلا تو مڑ کر کہنے لگا۔ میں پھر آؤں گا تو آپ کو سب کچھ بتاؤں گا۔ باجی کپڑا بازار ہی سے خریدو گی نا۔''

''ہاں عبداللہ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد ہی میرے اوپر شدت سے یہ آرزو طاری ہونے لگی۔ کاش میں اس دور میں زندہ ہوتی جب دیواروں پر گھر تا گھر کھڑکیاں ہوا کرتی تھیں اور خوف یا الم کی ایک چیخ درد و کرب کے عالم میں نکلی ہوئی ایک کراہ آنِ واحد میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سننے کو اس گھر میں جمع کر دیا کرتی تھی جہاں ان کی ضرورت ہوتی، بس ایک آن میں سارے فاصلے اور دوریاں طے ہو جاتیں۔ اونچی اور پختہ دیواروں کی ساری رکاوٹیں دھند کی طرح فضا میں تحلیل ہو جائیں۔ اور اب مرمر کی سلوں اور آہنی جنگلوں اور اونچے اونچے پھاٹکوں کے دور میں یہ ممکن نہیں۔ شام دھندلی، سرد اور کجلائی ہوئی تھی۔ فضا میں دہشت اور افسردگی کا شدید تاثر تھا یا میں محسوس کر رہی تھی کہ میری نظر اس پر پڑی، وہی کالے کوّے کے پر جیسی سیاہ رنگت، گہرا گہرا کاجل لگی پیلی پیلی پھٹارہ آنکھیں، جوتے سے مشابہہ لمبوترا چہرہ، شانوں تک تراشے ہوئے خضاب میں لتھڑے بالوں کی سیاہی میں اودا پن نمایاں، کانوں میں بڑے بڑے بالے، میں نے اس کو اسی مخصوص درخت کے نیچے کھڑا دیکھا۔ جہاں کام کاج سے فارغ ہو کر اسے دیکھتی تھی۔ اس تیز جامنی رنگت کی شلوار پر نارنجی اور جامنی پھولوں والی قمیص اور شلوار کا ہم رنگ دوپٹہ لے رکھا تھا۔

شام کے جھٹ پٹے میں اس کو دیکھ کر میری روح لرز گئی اور میں اندر آ گئی۔ جب عبداللہ نے اس کے بارے میں اپنی تحقیق بیان کی تھی کہ یہ کھسرا ہے۔ مالک مکان کا کھانا پکاتا ہے۔ یہیں کوارٹر میں رہتا ہے تو میں نے عبداللہ کو سختی سے تاکید کی تھی خبردار

اس کے قریب نہ جانا۔ کبھی بات نہ کرنا، بہت خراب ہوتے ہیں یہ، اندر آنے کی کوشش کرے تو بھگا دینا۔ کیوں کیا خرابی ہوتی ہے ان میں؟ عبداللہ ہر وقت اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کا خواہاں رہتا۔

ہاں کیا خرابی ہوتی ہے، میں نے دماغ پر زور دیا مگر کچھ ذہن میں نہ آیا۔ دراصل میں نے بچپن ہی سے گھر میں باہر بھی لوگوں کو ان سے گھبراتے اور نفرت کرتے دیکھا تھا۔ انھیں دیکھ کر مرد بھی سٹپٹانے لگتے اور عورتوں کو نروس ہوتے دیکھا۔

شادی بیاہ ہو یا بچے کی پیدائش، یہ جیسے کہیں اوپر سے برس پڑتے چھم چھم گھونگرو بجاتے، تالیاں پٹخاتے پھٹی پھٹی آوازوں میں اے مبارک سلامت گاتے۔

تمام عمر یہ خواہش رہی کہ ایک بار ان کا بھرپور رقص دیکھوں تو۔ مگر کیا مجال جو ان کو ٹکنے دیا جاتا ہو۔ ادھر ان کے گھنگھروؤں اور ٹھمکوں کی باج تالیوں کی پٹخار کے ساتھ آئی۔

''اے دولہا دلہن کی جوڑی سلامت، اے بی دولہا کی اماں سلامت، اے چچا رانی کی خیر، اے بوا نصیبن کدھر مر گئیں، اکیلی اکیلی نہ سمیٹو، اے ہماری ویل دلواؤ۔''

ادھر ان کو ٹرخایا گیا جلدی جلدی انعام اکرام تھما کے۔

بس بس چلو چلو۔

ملازمین ان کو یوں ہنکاتے، جیسے ہری بھری فصلوں سے چڑیاں اڑاتے ہوں۔

اس وقت مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ یہ سیم کی ماری بنجر زمینیں ہیں۔ اور انھیں ہری بھری فصلوں سے دور رکھنا لازم ہے۔

بس میرے دل میں تو یہ یہی خیال آتا تھا کہ کاہے کو لوگ ان سے گھبراتے ہیں یہ تو Harbingers ہیں۔ خوشیوں کے نقیب۔ مگر جب سب ان ہی سے نفرت کرتے تھے تو ہمیں بھی (Pretend) کرنا پڑتا تھا۔ ان کے کئی کئی نام لیے جاتے تھے۔ خوجے، ہیجڑے، خسرے۔ مگر اچھے گھروں کی بیبیاں کہ نفاست پسندی کے سبب منھ پر نازیبا کلمات لانا ایٹی کیٹ کے خلاف سمجھتی تھیں۔ اور ہمارے گھروں میں ان کو تالی بجانے

والے کہا جاتا تھا۔ پھر (Pretend) کرتے کرتے ان سے خوف سا آنے لگتا۔ مگر وہ پھریری کبھی نہ آئی جو ان کو دیکھ کر خواتین کو خاص طور پر لیتے دیکھتی تھی۔

تو چنانچہ جب پہلی مرتبہ نرگس پر نظر پڑی تو میں گھبرا گئی۔ یااللہ یہ کیا جگہ ہے کہ سب تو اسباب وخشت تھے ہی کہ اب ایک تالی بجانے والا اس پر مستزاد ہوگیا۔

نرگس ہر روز پکارندھ کر نہا دھو کر تیز تیز رنگوں کے جوڑے بدلتا۔ مگر میں تو اس پر پوری نگاہ ڈالے بغیر ہی اندر چلی جاتی تھی۔ عبداللہ کو گئے دوسرا دن تھا کہ اچانک دیگچی چولھے پر رکھتے رکھتے انکشاف ہوا کہ پیاز تو موجود ہی نہیں۔ میں نے چولھا بند کیا اور روپیہ ہاتھ میں لیے چبوترے پر آ کھڑی ہوئی، مین گیٹ سے باہر کی طرف پُرامید نگاہوں سے کسی امداد غیبی کو تلاش کر رہی تھی کہ اچانک کسی نے قریب آ کر کہا:

''بی بی! کچھ منگانا ہے کیا بازار سے؟''

بھاری بھاری آواز نے چونکنے پر مجبور کیا۔ منہ اٹھا کر دیکھا تو نرگس! اندر ہی اندر میں لرز گئی، نفرت سے نہیں خوف سے۔

اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا لاؤ جلدی سے دو، بتاؤ کیا چاہئے ہے۔ ایسے میں بڈھا سو رہا ہے میں لادوں۔

میں نے جلدی سے روپیہ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

''پیاز منگانا تھی۔''

اس نے چپکے سے پیاز دیتے ہوئے کہا پیسے نکال رکھا کرو۔ بڈھا بڑا خبیث خرانٹ ہے دیکھ لے گا تو آفت کر دے گا، مگر جو منگانا ہو تو بتا دینا مجھے۔

میں چپ رہی۔ دل میں یہی نیت تھی کہ میں اس سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گی، دو تین دن گزر گئے۔ مغرب کے وقت مجھے ایک خط پوسٹ کرنے کا خیال آ گیا۔ پوسٹ آفس نزدیک ہی تھا۔ میں لفافہ پکڑے گیٹ تک گئی تو نہ جانے کدھر سے نکل کر اس نے سرگوشی میں کہا، اس وقت خط ڈالنے جا رہی ہو لاؤ مجھے دو میں ڈال آؤں۔

''نہیں میں ڈال آؤں گی۔'' میں نے اسے ٹالا۔

اے بچی، یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس وقت نہ نکلا کرو، لاؤ مجھے دو۔

لفافہ اس نے میرے ہاتھ سے لے لیا۔

میں سر جھکائے اندر آ گئی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میری دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی نمودار ہوگئی ہو۔

کئی دن گزر گئے۔ ایک شام دل بہت لوٹ رہا تھا، پڑھتے پڑھتے تھک چکی تھی۔ سوچا وقت گزاری کو آٹا گوندھ لوں۔

وہیں برآمدے میں پیڑھی ڈال کر آٹا گوندھنے لگی۔ اتنے میں جافری کے بند دروازے پر کسی نے ہاتھ مارا۔ میں نے منہ اٹھا کر دیکھا تو نرگس نے کہا۔

اے بچی، میں نے تمہاری چوکی پر پاندان رکھا تھا۔ پان ہوں تو ایک آدھ پتا دے دو۔

میں نے اٹھ کر ایک پتا اس کو پکڑا دیا۔

اے ہے بالکل اکیلی بیٹھی ہو۔ وہ اندر آ گئی۔ میں نے تکلفاً دوسری پیڑھی بڑھا دی۔ مگر دل کانپ رہا تھا۔

آٹا گوندھنا نہیں آتا تم کو؟

نہیں! کبھی گوندھا ہی نہیں۔

چلو ہٹو مجھے دو۔

میں نے سن رکھا تھا یہ مکروہ لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کا چھوا کھانا پینا ٹھیک نہیں۔ مگر آٹا گوندھنے سے خفقان جو ہو رہا تھا، اس کے تحت لگن اس کے سامنے سرکا دی۔

وہ آٹا گوندھ رہی تھی یا گوندھ رہا تھا اور میں اپنی ایک ایسی ٹاک کے بارے میں سوچ رہی تھی جو مجھ سے ریڈیو والوں نے مانگے تانگے کے خلاف لکھوائی اور کروائی تھی۔ زمانہ طالب علمی میں لکھی ہوئی اس ٹاک پر آج میں نادم ہو رہی تھی۔ مانگے تانگے میں کیا برائی ہے، اس بہانے ایک دوسرے کی خیر خبر تو رہتی ہے۔ یہ تو نہیں کہ جس گھر

کی طرف دیکھو سختی سے دروازے بند، کھڑکیاں بند۔ انسان نہ ہوئے ہیرے جواہرات ہوگئے کہ آہنی تجوریوں میں بند مقفل پڑے ہیں۔

اچھا تو اب یہ طے ہے کہ اب اگر کبھی ایسی ٹاک کی فرمائش کی تو مانگے تانگے کی حمایت میں لکھوں گی۔

نرگس نے جھٹ پٹ آٹا تیار کیا اور اٹھ کر چل دی۔ وہ نامراد آ گیا ہوگا۔

اس دن میں نے قریب سے نظر بھر کر نرگس کو دیکھا۔ قریب سے اس کی رنگت اور بھی سیاہ بلکہ نیلی نظر آئی۔ چہرے کی مشابہت جوتے سے اور بھی قریب تر تھی اور آنکھوں کا پھٹارہ پن کاجل کے گہرے گہرے ڈوروں کی شمولیت میں اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ لیکن خواہش کے باوجود آج مجھے اس سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔

اس کے جانے کے بعد عجیب سی بازگشت ہونے لگی۔

نہ آدم! نہ آدم زاد! ہو حق! سناٹے کا عالم۔

جھٹ پٹے سے جب خالی ویران قلعے میں تھکا ماندہ شہزادہ داخل ہوا تو محل کے ایک در میں ایک بلی داخل ہوئی۔ سیاہ فام بلی نے دونوں ٹانگوں پر کھڑے ہو کر کہا۔

خوش آمدید شہزادہ عالم۔

شہزادہ حیران پریشان! مگر گومگو کے عالم میں اندر بڑھتا گیا اور یوں نرگس کا آنا جانا میرے گھر کے اندر ہوگیا۔

ایک دن میں نے پوچھا تم بازار تو نہیں جاؤ گے۔

میں نے دیکھا اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر تھا۔

میں کوئی مردوا ہوں جو تم مجھے کہتی ہو جاؤ گے، آؤ گے۔

پھر کیا کہوں۔

جا تو رہی ہوں بازار کو، یہی پوچھنے آئی تھی کہ کچھ منگانا تو نہیں ہے؟

اس دن سے میں نے نرگس کو تذکیر کے طرز تخاطب سے مخاطب کرنا چھوڑ دیا۔ پھر بھی اس کے چہرے کا مردانہ انداز اور بھاری آواز مجھے گڑبڑا دیتی تھی۔ اور

میرے منھ سے اس کے لیے تذکیری افعال نکل جاتے تھے مگر میں فوراً ہی تلافی کر دیتی۔

نرگس اب اکثر آتی اور آتے ہی پیڑھی پر چڑھ کر بیٹھ جاتی۔ پھر پوچھتی پان ہے؟

ہاں ہاں لوکھاؤ میں پاندان اس کے حوالے کر دیتی۔ وہ پان بنا کر کلے میں گلوری دبا کر چھالیہ کترنے بیٹھ جاتی۔ وہ عموماً خاموش رہتی، مگر رو میں آتی تو باتیں بھی کرتی۔

میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے ماضی میں گم رہتی ہے اس کا ماضی بھی کیا ہو سکتا ہے۔ ویران، بنجر اور سیم زدہ زمین کے ماضی اور مستقبل کی طرح۔

لیکن یہ میری بھول تھی۔

ایک روز اس بھول کا انکشاف یوں ہوا کہ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ ایک دو روٹیاں ہی ڈال لوں کہ نرگس آ گئی، کچن میں جھانک کر بولی روٹی ڈال رہی ہو، بیٹھو میں ڈال دیتی ہوں۔ میں جو اس قسم کے آفر کی منتظر رہتی جھٹ باہر نکل آئی۔ لو ڈالو۔

جھٹ پٹ اس نے چار چپاتیاں پکا کر رکھ دیں۔

اے نرگس تم بڑی اچھی چپاتی پکاتی ہو کہاں سے سیکھی۔

اے لو کہاں سے سیکھتی، میں نے اپنی ماں سے سیکھی۔

نرگس تمہاری اماں بھی تھیں؟ شروع ہی سے ذہن میں یہ بسا ہوا تھا کہ یہ تالی بجانے والے کھسرے کچھ اور ہی مخلوق ہیں۔ اور ان کی اماں وماں خاک ہوتی ہوگی۔ وہ ہنس پڑی۔ اے بچی کالج میں پڑھاتی ہو اور ایسی باتیں کرتی ہو بھلا کوئی بے اماں کے بھی پیدا ہوا ہے۔

''تمہارے بہن بھائی بھی ہوں گے؟''

''پانچ بہن بھائی تھے۔''

''سب تمہارے جیسے تھے؟''

''نہیں تو میں ہی بس ایسی نکل گئی۔''

پھر وہ اپنے گھر کے نوسٹلجیا میں مبتلا ہوگئی۔

اور اسی دن مجھے احساس ہوا کہ نوسٹلجیا کچھ اتنی بری چیز تو نہیں کہ ہم اس سے الرجک ہونے لگیں۔اس سے تو بڑے بڑے خاکے اور نقشے ابھرتے ہیں۔

اس کے نوسٹلجیا سے اس کے گھر کا جو نقشہ برآمد ہوا وہ یوں تھا کہ لکھنؤ کے محلے ایلچ خاں کے میدان میں اس کا گھر تھا، دو کمروں اور دالان والا۔ اس گھر کی کھپریل پر کدو کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ آنگن میں چھوٹی سی کوئیاں (کنواں) تھی۔ اس کی اماں کو صفائی ستھرائی کا خبط تھا۔ وہ کڑھی بہت اچھی پکاتی تھی۔ اس نے پہلے تو نرگس کو لڑکا بنا کر رکھنے کی کوشش کی۔ محنت کش باپ کے ساتھ کام پر بھی بھیجنا چاہا۔ مگر بات بنی نہیں۔ پھر مجبور ہو کر لڑکیوں کے پہناوے پہننے کی اجازت دے دی۔اور چٹیا بڑھانے کی ڈھیل بھی۔وہ اپنے ماضی کے چھوٹے چھوٹے قصے بیان کرتی تو میں سوچا کرتی کہ اس کی ماں کو اس کی نوعیت پر کیسا لگتا ہوگا۔

وہ بڑے ناز سے مٹک کر کہتی میری اماں مجھے چھپا چھپا کر رکھتی تھی کہ کہیں ہیجڑوں کی نظر نہ پڑ جائے۔

کیوں! ہیجڑے کیا کرتے؟

وہ پھر ہماری جیسوں کو چھوڑتے نہیں۔اپنی ٹولی میں شامل کر لیتے ہیں۔ بہت میری اماں نے مجھے چھپائے رکھا۔ محلے میں ایک شادی تھی۔یہ مبارک بادیاں لگانے آئے تو میرا دل مچل گیا۔جی چاہا اس وقت ان کے گھنگرو کی باج پر ناچنے لگوں۔ ان کی نظر بھی مجھ پر پڑ گئی۔انھوں نے میرے باپ کی، ماں کی بڑی منت سماجت کی، نہ مانے۔ بلکہ باپ تو مان بھی گیا۔ چل دفع کر جب یہ خود بھی جانا چاہتی ہے تو جائے۔ ہمیں کون سی بیاہ باراتیں چڑھانا ہیں اس کی،مگر میری ماں مجھے کلیجے سے لگا کر رونے لگی۔

یہ کہتے کہتے نرگس کی آنکھیں پچھتاؤں اور دکھ کے وفور سے لال انگاروں کی طرح دہک سی گئیں۔

مگر بچی میرا تو دل ہی اکھڑ گیا تھا۔ وہ مجھے پتا دے گئے تھے اپنے ڈیرے کا، جو میرے محلے سے دور نہ تھا۔ دو چار دن بعد ایک دن میں لالہ کی دکان تک جانے کے بہانے نکلی، اور بھاگ کر چھوٹی ٹولی میں شامل ہوگئی۔ تین مہینے انھوں نے جب مجھے پرکھ لیا تو انھوں نے تقریب کی۔

تقریب کیسی؟

بڑی زبردست ہوتی ہے، بلاوے بٹتے ہیں، بڑی تیاریاں ہوتی ہیں، آس پاس کے قصبوں تک کی ٹولیاں اپنے ساز سازندے لے کر شریک ہوتی ہیں، دیگیں چڑھتی ہیں، ہفتوں گانا بجانا ہوتا ہے۔ پھر اس نے بڑے فخر سے کہا ہمارے یہاں تم لوگوں کی طرح ایک دو دن کی تقریبیں نہیں چڑھتیں، ہم تو ہفتوں خوشیاں مناتے ہیں۔

نرگس کا عفریت نما مالک بڑ بڑ کرتا زینے سے اتر رہا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر چل دی۔

ایک دن میں نے نرگس سے سوال کیا۔

ایک بات بتاؤ، تم تو لکھنؤ میں تھیں، تم پاکستان کیسے پہنچیں۔

اے لو کیسے پہنچی میں اپنی ٹولی یونٹ کے ساتھ آئی۔

میں سمجھی یہ اپنی ٹولی کو یونٹ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ مگر اس نے تن کر کہا، یونٹ نہیں جانتیں۔ میں فوج میں تھی۔

اے ہٹو، کھسرے کب فوج میں ہوتے ہیں۔

کیوں نہیں۔ دوسری جنگِ عظیم تھی نا جب ہمیں انگریز نے بھرتی کیا تھا۔

اب وہ اکڑتی ہی جا رہی تھی۔

مریضوں کی مرہم پٹی کے لیے ویکائیوں میں بھرتی ہوئی ہوگی۔

اے لو۔ دیکائیوں میں کیوں۔ ویکائیاں تو عورتیں ہوتی تھیں، ہم الگ بھرتی ہو رہے تھے۔

کیوں گپیں مارتی ہو۔

لو گپیں۔ ارے ہم برما گئے ہیں، رنگون یونٹ کے ساتھ رہے، اراکان کے محاذ پر بھی رہی تھی میں۔

میں اس کی صورت پر سچ جھوٹ کو تلاش کر رہی تھی۔ لیکن وہ رنگون اور برما کے محاذوں کی اتنی سچ سچ باتیں اور جنگی محاذوں کی اصطلاحیں اتنی بے تکلفی سے استعمال کر رہی تھی کہ یقین کرنا پڑتا تھا۔

تم کو کس لیے بھرتی کیا گیا تھا؟

''مجرا کرنے کے لیے۔'' اس نے بڑے ناز سے گردن اٹھائی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی کجلائی ہوئی بے رونق آنکھوں میں ماضی کی گہما گہمی اور رونقیں جھمک رہی تھیں۔

پھر گپ لگائی۔ محاذوں پر مجرا کون دیکھتا ہوگا۔

اے لو، ہم کو بھرتی کیوں کیا گیا تھا۔ پچھلے مورچوں میں پڑے پڑے جوان اکتا جاتے، ایک دوسرے سے لڑنا جھگڑنا اور اپنی بوٹیاں نوچنے لگتے تو پھر کور کمانڈر مجھے بلا کر حکم دیتا۔

''ولِ نرگس آج شام مجرا لگے گا۔''

ٹھیک ہے ساب! میں سلوٹ مارتی۔ بس دن رہے سے تمبو تن جاتے۔ جوان اپنی اپنی کرسیاں لا کر جمانے لگتے۔ اسٹیج بننے لگتی، اپنی ٹولی کو اٹینشن رہنے کا آرڈر دیتی۔ دن ڈھلنے سے پہلے ہی بناؤ سنگھار شروع ہو جاتا۔

تم لوگ لباس کیا پہنتے تھے؟

ساڑھیاں باندھتے تھے، جارجٹ کی، کارچوبی کام کی ساڑھیاں، جوڑے بندھنے لگتے۔ جس کے پٹے تھے وہ بال سنوارتیں۔ سنگھار و نگار شروع ہوتا۔

سرخی پاؤڈر مل جاتا تھا؟

لو کیوں نہیں۔ میجر صاحب سپلائی کے ساتھ لاتے تھے، وہ سپلائی کے میجروں، کپتانوں اور لیفٹیننٹوں کے نام فر فر لیتی۔ اروڑہ، کھنہ، چوپڑہ، قادر، بلونت سنگھ، ارجن سنگھ،

مقبول مہندر، میجر جسونت سنگھ تو آتے ہی مجرے کا ڈول ڈالتا۔ کبھی کبھی تو مجھے اکیلی کو میس میں بلا لیتا، مگر ویل بڑے کھلے ہاتھ سے دیتا تھا۔ بس ہاتھ میں گلاس میز پر بوتل دھری ہے، لال لال آنکھیں، ذرا تال رکتا تو اشارہ کرتا ناچو، ناچتی جاؤ نرگس۔ میز پر سر رکھ دیتا۔ مجھے تکتا رہتا۔ میں ناچتی رہتی۔ بس اس کی آنکھوں میں محبت ہی محبت ہوتی۔

یہ باتیں کرتی نرگس کسی اور ہی عالم میں ہوتی۔ ایک عجیب بہارین کیفیت اس کے سارے وجود پر چھائی ہوتی۔

میں نے چونک کر دیکھا اس کے وجود پر صدق و سرور کا ایک ایسا عالم طاری تھا کہ جس نے میرے خیال کی تردید کر دی۔

نہیں! نہیں، یہ جو کچھ کہہ رہی ہے سب سچ ہے۔ میرے اندر کا ہر احساس تصدیق کر رہا تھا۔

توبہ! جنگ اور محاذ پر انسان کتنا عجیب اور پر اسرار ہو جاتا ہے۔ میرے منہ سے نکلا۔

کیا کہہ رہی ہو۔ اس نے بھول پن سے استفسار کیا۔

تمہارا میجر بن بیاہا تھا؟ میں نے بات بدل دی۔

کیوں بن بیاہا کیوں ہوتا۔ نرگس برا مان گئی۔ پیچھے ایک بیوی اور چار مہینے کا بیٹا چھوڑ کر آیا تھا۔ تصویریں جیب میں رکھتا تھا۔ میں ناچتی ناچتی تھک جاتی تو مجھے صوفے پر بٹھا لیتا۔ میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے ان کی تصویریں دکھاتا۔ کہتا تھا، لام ٹوٹے گی اور میں گھر جاؤں گا تو اقبال سنگھ بھاگا بھاگا پھرتا ہوگا۔ میں پوچھتی بھلا تم نے اپنے لڑکے کا نام مسلمان کے نام پر کیوں رکھا۔ تو بی بی وہ کہنے لگا۔ کوئی شاعر ہوگا اقبال! اقبال کہ مجھے اس سے بڑی عقیدت ہے اور میں نے اس کے نام پر بالے کا نام رکھا ہے، مگر بھاگوان کو اپنے بالے کی دید نصیب نہ ہوئی۔ ایک رات اراکان پر زبردست بمباری ہوئی اور میرا میجر اسی کی نذر ہوگیا۔

یہ کہتے کہتے نرگس آبدیدہ ہوگئی۔

لگتا ہے جیسے میں کسی آرٹ گیلری میں کھڑی مصوری کے کسی شاہکار کو دیکھتی ہوں۔

''اُف کتنی مکمل، کتنی جامع اور ہر طرح کے رنگوں سے معمور زندگی کی کیسی بھرپور تصویر ہے۔''

میں بالکل بھول جاتی ہوں کہ یہ مصور کا میورل نہیں خود زندگی ہے۔ بس یہی زندگی کا نقش دھیرے دھیرے اس تناظر سے جدا ہونے لگا۔ میرے انجانے میں شاید یا پھر نجانے کیا بات ہوگئی۔ خیر اس وقت تو آپ گواہ رہیں کہ زندگی کے اس نقش کے پھیکا پڑ جانے پر (یا یوں سمجھئے کہ جیسے کسی نے میورل کو دھو کر صاف کر دیا ہو) یا ایسی کسی بھی حرکت کا الزام میں نے گلی کے نکڑ پر کچی بستی کے گھروں میں تیزی سے بدلتے معیاروں کو نہیں دیا۔ نہ ہی اس میں قصور وار مقابلے چشمکوں اور ہر دوڑ میں آگے نکل جانے والے جذبوں کو بتایا ہے۔ نہ ہی میں نے اس سب کا الزام ان گھروں میں آجانے والے ٹیلی ویژن سیٹوں، واشنگ مشینوں کے سر تھوپا ہے۔ نہ ہی فریجوں کے... مگر خیر فریجوں کے نام پر یہ سوچ اُبھرتی ہے کہ سبزی والا بد دل تو اسی سبب ہوا تھا، جب وہ کسی پاس سے گزرتی... (برقع میں نہیں چادر میں لپٹی) خاتون سے پوچھتا، خالہ آج کچھ نہیں لوگی۔ تو وہ خاصی نخوت سے فوراً بول پڑتیں۔

اے بھیا، آٹھ دن کی سبزی تو لا کر فرری ی ج (فریج) میں بھر دی ہے، اب اور لے کر کہاں رکھوں گی۔

بس ایسے ہی جوابوں سے دل کی شکستگی بڑھتی گئی۔ کسی کو شاید احساس بھی نہیں ہوا۔ لیکن اب اس گلی میں اس کی لہکتی ہوئی آواز نہیں سنائی دیتی۔

''گاجر لو۔ مٹر لو، آلو لو...''

بس اسی پر کیا موقوف ہے۔ اب یہاں آوازیں سرے سے سنائی ہی نہیں دیتیں... ایک سناٹا سا محسوس ہوتا ہے۔ لگتا ہے جیسے آبادی کے لوگ اپنے اپنے گھروں دروازے بند کر کے کہیں اور چلے گئے ہوں (حالانکہ سب اپنے اپنے گھروں میں موجود اور برقرار ہیں۔ بجز ان چند لڑکوں کے جو اسکولوں سے آکر گلی میں دوڑا بھاگا کرتے اور

وہ بہت غیر جذباتی اور سپاٹ سی تھی۔ کسی بات پر اکسائٹ نہیں ہوتی تھی۔ کسی سے محبت کرتی تھی نہ نفرت۔ اسے غصہ بھی نہ آتا تھا اور اب میں نے اس کی پھٹارہ سی آنکھوں میں شبنم سی ابھرتی دیکھی تو میرا دل دکھ گیا۔

نرگس تم کو جسونت سے واقعی محبت تھی۔

بی بی محبت تو وہ خود کرتا تھا۔ بڑا دلدار تھا۔ جب کبھی ماں کو یاد کرتی تو تسلی دیتا۔ گھبراؤ نہیں نرگس، لام ٹوٹے گی تو تجھے ساتھ لے جاؤں گا۔ ماں کے پیر پڑ جائے گی تو اٹھا کر گلے سے لگا لے گی۔ اپنی لمبی لمبی پلکوں والی خوب صورت ڈوروں والی آنکھیں جھپکا کر کہتا۔ ماں بڑی چیز ہوتی ہے۔ نرگس میری بے بے بھی لدھیانے بیٹھی مجھے یاد کرتی ہے۔ کرنیل سنگھ آیا تو بے بے نے اس کے ساتھ گاجر کا حلوہ اور جلیبیاں بھیجی تھیں۔ میں نے جلیبیاں تلوا کر کھائیں تو تازہ جلیبیوں کا مزا آ گیا۔

باہر کی طرف شور و شر تھا، اندر خاموشی تھی۔

مالک مکان شاید نرگس کو اس کی تھاں پر نہ پا کر غوغا مچا رہا تھا نرگس بات کرتی کرتی اٹھ کر چل دی۔ تاکہ جلدی سے چائے کی پیالی اس کے منہ سے لگا دے۔

کئی دن گزر گئے وہ نہ آئی، نہ اپنی مخصوص جگہ پر کھڑے اس کو دیکھا۔ ایسا لگتا تھا میرے گھر کی دیوار میں زمانۂ قدیم کی جو کھڑکی نمودار ہوگئی تھی جس کے ذریعے ایک گھر دوسرے سے باخبر رہتا تھا، کسی نے بند کر دی ہو۔ میں رہ رہ کر پچھتاتی تھی کہ کاہے کو میں نے اس کو باتوں میں لگا کر بٹھائے رکھا۔ ایسا لگتا تھا کہ چائے میں تاخیر کی بنا پر اس کے مالک نے اس کو جواب دے دیا۔

ان ہی دنوں مجھے بخار آنے لگا۔ ان دنوں مجھے شدت سے ان بھنگنوں کا خیال آتا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ محلوں اور علاقوں میں خبر رساں ایجنسیوں کا کام دیتی تھیں۔ ہر گھر کی بیماری، دکھ سکھ سے تمام گھروں کو باخبر اور شریکِ غم اور خوشی رکھتی تھیں۔ مگر اب ایل ڈی اے کے قوانین کے مطابق گھروں کے درمیانی فاصلوں کے پیشِ نظر گھروں کو کھڑکیوں سے متصل نہیں کیا جا سکتا۔ اور اب بھنگنوں کی خبر رساں

ایجنسیوں کی اہمیت یوں مفقود ہو چکی ہے کہ گھروں میں ریڈیو ہے، اخبار ہیں، ٹیلی ویژن ہیں اور غسل خانوں میں فلش لگ گئے ہیں۔

بدقتِ تمام اٹھ کر چائے بناتی تو آنکھیں اور کان نرگس کی دستک پر لگے رہتے کہ وہ آ کر کہے گی۔

''اے بچی بخار میں چائے نہ بناؤ۔ ہٹو میں بناتی ہوں۔''

ایک دن بخار اترا تو میں بیماری کو بہلانے کے خیال سے بازار کو نکل گئی اور کافی دیر بعد جب بلا ضرورت ایک مٹی کی صراحی اٹھائے میں گھر کے چبوترے کی طرف آئی تو چبوترے کے سامنے جیپ کھڑی تھی۔ میرا خالہ زاد بھائی اپنا بوریا بستر لیے چبوترے پر منتظر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا میں چھوڑ آیا ہوں ایک کمرہ مجھے الاٹ کرو۔ جلدی کرو مجھے جب تک نیا مکان نہیں ملتا تمہارے سر پر رہوں گا۔

اچھا کیا جو تم آ گئے۔ میں نے ایک ہی سانس میں علاقے کی پر اسراریت اور ہولناکیوں کا ذکر شروع کر دیا۔

مگر وہ سننے کے موڈ میں نہ تھا۔

یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے چائے پلوا دو، کڑک چائے۔

اس کی آمد کی رونق اور گہما گہمی میں نرگس کی غیر حاضری کی مدت کا حساب کتاب یاد نہ رہا۔ اول تو ناشتے سے لے کر رات کے الارم تک ضابطے اور کام مقررہ اوقات میں کروانے کا عادی، پھر کبھی اس کے سسرالی رشتے دار اور کبھی ملنے والوں کی آمد کی مصروفتیں۔ مگر کام کی زیادتی کے وقت میرے کان نرگس کی چاپ اور دستک کے متلاشی رہتے۔ وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔

ایک شام وہ کام سے واپس نہ آیا۔ چھ بجے، سات بجے تقریباً آٹھ بجے۔ میں پریشان ہو کر چبوترے پر جا کھڑی ہوئی۔ مارچ کا مہینہ تھا۔ ہر طرف نوشگفتہ شگوفوں کی مہک اور بہار تھی۔ آسمان پر تاروں کے جلو میں چاند دھیرے دھیرے ابھر رہا تھا۔ سب کچھ برا لگ رہا تھا۔ وحشت میں یہ بھی نہ خیال آیا کہ میں اس وقت یوں یہاں

چبوترے پر نہیں کھڑی ہوتی ہوں۔ ابھی ہوا میں خنکی موجود تھی۔ میں ٹکٹکی باندھے گیٹ سے باہر ہر آنے جانے والی گاڑی کی روشنی پر نظریں جمائے تک رہی تھی کہ ایک سایہ جھاڑیوں سے نکل کر چبوترے کی طرف آیا۔ اندھیرے میں اس کی سیاہی اتنی گھل مل رہی تھی کہ وہ نظر ہی نہ آ رہی تھی۔ مگر سائے کے کھڑے ہونے کا انداز وہی تھا۔

کون؟ نرگس!

کیا بات ہے۔ آج تم ناوقت یہاں کیسے کھڑی ہو۔ وہ چبوترے پر آ گئی۔ میرا بھائی آج اب تک نہیں پہنچا، صبح کا گیا ہوا ہے۔

ارے مردوں کا کیا ہے یہ گھومنے پھرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔

مگر وہ تو وقت کا پابند ہے کبھی دیر نہیں کرتا۔

ہاں یہ تو میں بھی دیکھتی ہوں، وخت سے آنا وخت سے جانا۔

میں اس کے ساتھ برآمدے میں آ گئی۔ میں نے دیکھا تشویش تو اس کے چہرے پر بھی تھی مگر میری تسلی کر رہی تھی۔

ان فوجیوں کے بڑے یار دوست ہوتے ہیں، انشاء اللہ آتا ہی ہوگا۔

لاؤ تم مجھے ایک پان تو کھلا دو۔ دیکھنا ابھی پہنچنے ہی والا ہے۔ دوسرا اطمینان دلائے تو خود کو بھی اطمینان سا ہونے لگتا ہے۔

میں نے پان بنا کر دیتے ہوئے پوچھا۔

یہ بتاؤ تم کہاں غائب تھیں، میں تو سمجھی تھی نوکری چھوڑ گئیں۔

نوکری تو میں چھوڑنا چاہتی ہوں۔ پر رہوں کہاں۔ پھر وہ تھوڑا سا شرمائی۔ میں تو اس لیے نہیں آئی کہ تمہارا بھیا ہوتا ہے گھر میں۔

''میرا بھیا کیا تم کو کاٹ لے گا؟''

''پھر بھی شرم لحاظ تو کرنا ہی چاہئے۔''

مگر تم تو اس کے آنے سے پہلے غائب ہو۔ کہاں مر گئی تھیں۔

مرتی کہاں ہمارے یہاں شادی تھی۔

میں بھونچکا سی رہ گئی۔

شادی !تمہارے یہاں شادی!

ہاں!ہاں شادی میں گئی تھی۔

وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ جیپ کی روشنیاں چبوترے پر پڑیں۔

لوتمہارا بھیا آ گیا۔ اس نے ذرا گھونگھٹ سا کر لیا۔

بھیا حسبِ عادت جلو میں ایک عدد سالے اور دو اور لڑکوں کو لیے داخل ہوا۔

آتے ہی غلفل مچ گئی۔

سب کی نظر بچا نرگس دوسرے دروازے سے باہر کو لپک لی۔

رات کو ہر کام سے فارغ ہو کر جب میں اپنے کمرے میں کتاب لے کر بیٹھی تو مجھے نرگس کا خیال آ گیا۔

شرما کیسی رہی تھی جیسے کوئی عورت ہو۔ اور اب اس نے ایک اور نیا شوشہ چھوڑا ان کے یہاں شادی تھی۔ہم نے تو سنا نہیں،کھسروں کے یہاں بیاہ برات ہوتے۔

بہت زیادہ تھک جانے کی وجہ سے فوراً ہی نیند آ گئی۔

نرگس حسبِ معمول پھر کٹی کٹی پھرنے لگی، ایک دن میں نے اس کو بیکری میں پکڑا۔

کدھر رہتی ہو، کبھی آ بھی جایا کرو۔

اے بچی، تمہارے بھیا کی وجہ سے نہیں آتی۔

وہ تو صبح کا گیا تین چار بجے آتا ہے۔

اچھا یہ ٹھیک ہے، دوپہر کو آ جاؤں گی۔

دوسرے دن اس نے جافری میں سے جھانکا۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ پیڑھی پر آ کر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا نرگس، پہلے تو میں تم سے ڈرتی تھی۔ اور اب ذرا مانوسیت ہوئی تو جھانکتی نہیں۔

بس وہی ذرا شرم آتی ہے۔ دیکھو نا... وہ چپ ہوگئی۔

اچھا وہ جو تمہارے تھے جسونت، قادر، منظور، کرتار سنگھ، اروڑہ اور گورے سارجنٹ، ان کے سامنے ٹھمک ٹھمک ناچتے شرم نہیں آتی تھی۔

وہ تو میری ڈیوٹی تھی۔ آرڈر پر ہر کام کرنا پڑتا ہے۔ فوج میں آرڈر بڑی چیز ہے۔

اچھا یہ بتاؤ تم اس دن کیا کہہ رہی تھیں۔ ہمارے ہاں شادی تھی۔

ہاں تو اور کیا۔ ہمارے یہاں بھی شادیاں ہوتی ہیں بڑی دھوم دھام سے، ایسے ایسے مجرے ہوتے ہیں۔ کیا ٹھکانہ ہے۔ کوٹ لکھپت میں ہمارا ڈیرہ ہے۔ وہ ترنگ میں آکر بیاہ برات کے بیانات کرنے ہی لگی تھی کہ گاڑی کی آواز سنتے ہی ہوا ہوگئی۔

ایک دن وہ آکر بیٹھی ہی تھی کہ بھیا آگیا۔

میں نے دیکھا نرگس کو دیکھ کر وہ بھنا گیا۔ پیر پٹختا اندر چلا گیا۔ نرگس موقع ملتے ہی سٹک لی۔

میں اندر گئی تو اس نے معترض آواز میں محاسبہ کیا۔

یہ کیا ہوبی ہے؟

اے بھیا ہوبی کیا ہوتی ہے۔ انسان ہے۔

لاحول ولاقوۃ!

''اے بھیا۔ یہ بھی تو اللہ کی مخلوق ہے۔'' میں نے سفارش کی۔

''ہوگی۔ مگر اللہ کی مخلوق سے کہو کہ میرے سامنے نہ پڑا کرے۔''

''وہ نگوڑی تو خود ہی شرماتی ہے۔ بھئی میرا کام کردیتی ہے بچاری۔''

''بچاری وچاری نہیں ہوتے یہ۔''

وہی تعصب، جس میں پہلے میں مبتلا تھی۔

نرگس میں ایک خاص بات تھی۔ وہ دوسرے کھسروں کی طرح مٹکتی، بل کھاتی بالکل نہ تھی۔ نہ ہی تالی بجا کر بات کرتی تھی۔ شاید فوجی زندگی کا اثر تھا، یا اس کا مزاج

ہی ایسا تھا۔ ویسے بھی اس کا مزاج بڑا مختلف اور درویشانہ تھا۔ کپڑے تو خوب بھڑکیلے اور رنگدار پہنتی، سنگھار پٹار بھی کر لیتی، مگر بڑی بے طلب طبیعت تھی۔ بمشکل میں اسے چائے پلاتی یا کوئی خاص چیز پکاتی تو کھانے کو دیتی۔ بجز ایک پان کے اس نے کبھی کچھ طلب نہ کیا۔ اگر کبھی کوئی پیسہ دینے کی کوشش کی تو واپس کر دیتی۔ اس وقت رکھ لو ضرورت ہوئی تو تم ہی سے لے لوں گی۔ ارے مجھے فوج سے پنشن بھی ملتی ہے۔ بعد میں میں نے سنا نرگس ضرورت مندوں کی بڑی مددگار تھی۔ دے کر واپس بھی نہیں لیتی تھی۔

ایک دوپہر نرگس منھ لٹکائے آئی۔ بڑے میاں نے آج کسی بات پر بے حد شوروغوغا کیا تھا۔ یہاں تک کہ نرگس پر سودے میں پیسے بنانے کا الزام بھی لگا دیا۔ وہ آج بڑی مکدر نظر آ رہی تھی۔ قسم لے لو بی بی جو میں نے کبھی سودے میں پیسے بنائے ہوں۔ بھلا میں کس کے لیے یہ گناہ مول لوں گی۔ میری پنشن آتی ہے۔ دو سو یہ دیتا ہے۔ روٹی اس کے ذمے کھاتی ہوں۔ بھلا میں کس کے لیے اپنا ایمان خراب کروں گی۔''

میں نے اس کو ورغلانے کی کوشش کی۔

نرگس تم اتنا اچھا کھانا پکاتی ہو۔ چھوڑ دو اس کی نوکری۔ کہیں اور کر لو۔

بچی، نوکری تو آج چھوڑ دوں۔ میرے پاس گھر بیٹھے کتنی نوکریاں آتی ہیں مگر میں سوچتی ہوں کہ مجھے تو بہت نوکریاں مل جائیں گی مگر ان کمبخت پاگلوں کا کیا بنے گا۔ کوئی رہے گا ان کے پاس؟ یہ طوطی ہی ڈھنگ کی ہوتی تو کچھ کر لیا کرتی۔

میں بیٹھی اس کی صورت دیکھتی رہی۔ آج کے زمانے میں بھی کوئی ایسا ہے جو محض انسانی ہمدردی کی خاطر جبر برداشت کرنے پر تیار ہو۔

نرگس میں یہی ایک وصف نہ تھا۔ اس نے اپنے کسی کمال کسی ہنر کا کبھی ذکر نہ کیا تھا۔ ایک بڈھے کے مزاج کے علاوہ کسی کی برائی نہ کی۔ بجز ماضی کی یادوں کے اس کے پاس بات کرنے کا کوئی مواد نہ تھا۔ مگر آج وہ بہت رنجیدہ اور کبیدہ نظر آ رہی تھی، اتنی کہ اس کے چہرے کی سیاہی پر نیلاہٹ غالب آ رہی تھی۔

اس کو بہلانے اور ہنسانے کی ایک ترکیب میرے ذہن میں آ ہی گئی۔

نرگس،تم نے آج تک مجھے نہ تو گا کر سنایا، نہ ناچ کر دکھایا۔ آج کم از کم اپنا گانا تو سنا دو۔

اس نے گردن جھکالی۔پھر جو نظر اٹھائی تو میں نے محسوس کیا جیسے اس کی آنکھیں بھیگ رہی ہوں۔میں اب نہیں گاتی، نہ ناچتی ہوں۔

کیوں۔واہ بھئی۔میں تو سنوں گی۔ میرا ہمیشہ سے جی چاہتا ہے کہ تم لوگوں کا ناچ دیکھوں۔ گانا سنوں۔آج تو سنانا پڑے گا۔

اے بچی، میں بڑھیا ہوگئی۔ بوڑھے گلے سے کیا آواز نکلے گی۔

اب ٹالو نہیں۔نہ کوئی بڑھیا ہو۔اچھا ایک دو بول گا دو۔ اب پھر اس نے سر اٹھایا اور جیسے دور کہیں دیکھتے ہوئے بولی، جس دن اراکان پر بمباری ہوئی تھی اس دن کتنی جانیں گئی تھیں۔ جسونت، کیپٹن مقبول،اروڑہ، جگ جیت اور بہت سے جوان، بس وہ دن اور آج کا دن میں نے نہ تو گلے سے آواز نکالی نہ گھونگھرو باندھے۔

پھر لام پر تم کیا کرتی رہیں؟

میں نے کمانڈر سے عرض کیا کہ سر یا تو میری چھٹی کر دیں یا مجھے کسی اور کام پر لگا دیں۔ پھر بولے، اچھا جیسی تمہاری مرضی۔

پھر تم کو ویکاؤں کے ساتھ لگا دیا ہوگا۔

لو میں کیا کرتی ویکائیوں کے ساتھ۔ بڑی لفنگیاں ہوتی تھیں۔

اچھا تو پھر تم کس مرض کی دعا تھیں؟

صاحب نے پوچھا۔نرگس تم کیا کام کرنا مانگتی ہو؟

میں نے کہا صاحب، مجھے کھانا پکانا آتا ہے۔میں لانگریوں کے ساتھ کام کر لوں گی۔ بس میں لانگریوں کے ساتھ کام کرنے لگی۔

جسونت کا بڑا غم ہوا تم کو۔

وہ اب بہت دور کو تاک رہی تھی جیسے کوئی لق و دق صحرا میں کھڑا کسی گم گشتہ کو تلاش کرتا ہو، پھر بولی غم تو سب ہی کا ہوا۔ بچی سوچو جیتی جانوں کی کھیپ کی کھیپ۔

وہ چپ تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میر صاحب دکھ بھرے لہجے میں ماجرا بیان کرتے ہوں کہ:

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشان
مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

پھر وہ آہستہ آہستہ بولی۔ آخری مرتبہ جب وہ آیا تھا تو فلم لگی تھی، ہمارے میس میں۔ مجھ سے فرمائش کی آج میرے ساتھ چلنا۔ وہ کاسنی ساڑھی ضرور باندھنا، خوب سنگھار کرنا۔

میں نے ساڑھی باندھی، جوڑا باندھا، اپنا چندن ہار گلے میں ڈالا۔ دیکھ کر کتنا خوش ہوا، وہ یہاں تک ہی کہہ پائی تھی کہ جیپ کے رکنے کی آواز آئی۔ جھٹ وہ اٹھی اور نکل گئی۔ جتنی دل گرفتہ اور آزردہ ہو کر آئی تھی اس سے زیادہ افسردہ ہو کر گئی۔

وہ چلی گئی اور میں سوچتی رہی۔ شرم آنے کا تو بہانہ ہے۔ یہ بھی سمجھتے ہی ہوں گے نا۔ نارمل لوگ ہم سے نفرت اور کراہت کرتے ہیں۔

اسی دم یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ جسونت، منظور اور اروڑہ کے غم میں محو رہنے کا کیا سبب تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اسے زندگی کے نورم سے قریب تر ہونے کا موقع دیا تھا۔

دوسرے دن کی ڈاک سے عبداللہ کا خط ملا۔ وہ مجھے کبھی کبھی خط لکھتا تھا جس کا جواب میں فوراً دیتی۔ عبداللہ نے لکھا تھا، باجی! آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے بھائی صاحب کو جلد مکان مل جائے، جب سے آپ نے لکھا تھا کہ وہ رہنے کے لیے آئے ہوئے ہیں، مجھے بڑا اطمینان تھا۔ باجی وہ چلے جائیں تو تم بھی وہاں نہ رہنا، یہ مکان چھوڑ دینا۔ پھر شاید میں بھی آجاؤں آپ کے پاس۔ عبداللہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔ میں نے سوچا۔

یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ مجھے ایک مکان مل گیا۔

جانے سے دو دن پہلے نرگس کو اطلاع دی۔

نرگس ایک دم بجھ سی گئی۔ کہنے لگی تم چلی جاؤ گی تو یہ جگہ مجھے بری لگنے لگے

گی۔ پھر وہ رک رک کر بولی، مجھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس گھر میں میری لڑکی رہتی ہے۔ برا تو مجھے بھی لگے گا۔ یہ گھر بڑا خوبصورت تھا کبھی کبھی مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے میں مری میں رہ رہی ہوں۔ اور یہاں کتابوں کی الماریاں بہت خوبصورت تھیں۔ نرگس تم مجھ سے ملنے آؤ گی؟

میں خود تم سے کہنا چاہتی تھی کہ تمہارا بھیا چلا جائے تو تم بھی یہاں نہ رہنا۔ تم جہاں بھی ہوگی میں ضرور تمہارے پاس آؤں گی۔

اس نے اپنا وعدہ نبھایا۔ وہ اکثر مجھ سے ملنے آتی۔ بس وہی ایک پان کا مطالبہ، مشکلوں سے میں اس کو کھانا کھلاتی، چائے پلاتی، کتنا کہتی تھی بس کا کرایہ تو لے لو۔ مگر کبھی راضی نہ ہوئی۔

اے بچی میں اپنی محبت میں آتی ہوں، تم سے کرایہ بھروانے تھوڑی آتی ہوں۔ میرے آنے کے کچھ ہی دن بعد اس نے بڈھے کی ملازمت چھوڑ دی۔ بڈھے کا بیٹا تبدیل ہو کر آ گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا ملازم بھی تھا۔ اب نرگس کے پیشِ نظر پاگلوں کا کیا بنے گا والی مجبوری نہ تھی۔

بہت دن سے وہ نہ آئی تھی۔ اپنی مصروفیت میں اس کا خیال بھی نہیں آیا۔ ایک دن میں اس طرف گئی تو بس اسٹینڈ پر کھڑی ملی۔ سامنے ڈسپنسری سے آئی تھی۔ ہاتھ میں شیشی اور نسخہ تھا۔

مجھے دیکھ کر خلافِ عادت اس نے تالی بجا کر مخاطب کیا۔

ہائے نرگس !ارے اتنی کمزور ہوگئیں۔ کیا ہوا۔

بیمار ہوں۔ اس کی آنکھوں میں دھول ہی دھول نظر آ رہی تھی۔ بڑا بجھان تھا۔ میں سوچنے لگی، آدمی کا کیا ہے بس دھول ہی دھول ہوتا ہے، ایک پھونک مار وار کر کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔

تم اتنی بیمار ہو، چلو میرے ساتھ میں تمہارا علاج کروں گی۔

اے بچی! بس ذرا بخار آنے لگا ہے۔ ٹھیک ہوں گی تو ضرور آؤں گی۔ اس

دن کے بعد نرگس کبھی نہیں آئی۔کبھی راہ باٹ میں ملتی بھی نہیں۔

زندگی میں مہلت اتنی کم ہے کہ انسان چابی تک رکھ کر بھول جاتا ہے، مدت مدت کسی کا خیال نہیں آتا۔

اور نرگس کا جب بھی خیال آیا ایک دھول سی اڑی اور فضا میں گم ہوگئی۔ آج بھی میں سوچ رہی ہوں ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر... وہ جسونت ہو، جگجیت ہو یا اروڑہ، سب مشتِ غبار ہی تو ہوئے۔نرگس کی کیا حیثیت، بنجر اور سیم زدہ زمین سے اٹھی ہوئی ایک مشتِ غبار۔آج پھر جیسے میر جی نے صدا دی ہے۔

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشان
پوچھا جو میں نشان کی بازگشت اتنی بلند ہے کہ آگے کچھ سنائی نہیں دیتا۔

غل غپاڑا ڈالنے کے ساتھ ساتھ ایک بات کو خبر بننے سے پہلے ہی پورے محلّے اور علاقے میں پھیلا دیتے تھے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے تیزی سے بڑے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اور کہتے ہیں ان میں سے زیادہ تر پردیسوں کو سدھار گئے۔ اور جو یہاں رہ گئے وہ بھی تیزی سے مقابلے پر اتر آئے۔ یہ بھی سنتے ہیں، ان میں سے کئی گھروں میں گیراجوں کی تعمیر بھی ہو چکی ہے۔)

لیکن آپ گواہ رہیں، میں نے اس سناٹے، ویرانی اور زندگی کے رنگا رنگ میورل کے نظروں سے اوجھل ہونے کا الزام نہ گیراجوں پر دھرا ہے اور نہ ہی اس ضمن میں وی سی آر، رنگین ٹیلی ویژن، واشنگ مشینوں اور فریجوں پر دھرا ہے۔ اور نہ ہی میں نے اس سلسلے میں کچی آبادی میں تیزی سے بدلتے معیاروں اور مقابلے، دوڑ اور چشمکوں کے جذبوں کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔ بلکہ میں نے تو زمانے کا بھی شکوہ نہیں کیا کہ وقت کے خالق نے اس حرکت سے منع کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ ''تم وقت اور زمانے کو برا نہ کہو۔''

اور سچ بات بھی یہی ہے کہ وقت حادثات سے تغیر پذیر ہے اور خالق کی مخلوق ہے۔

مگر میں اس ٹنکی کو تو برا کہہ سکتی ہوں جو میرے اور اس طویل اور عریض میورل کے درمیان حائل ہوئی۔ جس کو زندگی کے شوخ و شنگ، ملیح، افسردہ اور خاکستری رنگوں کے آمیزے سے تیار کیا گیا تھا۔ صاف اور سچی بات تو یہ بھی ہے کہ اب خود مجھے بھی تو اتنی فراغت نہیں ملتی کہ ایسی تمام باتوں پر غور کروں۔ ملول ہوں اور فرسٹریٹڈ نظر آؤں۔ نہیں معلوم کیا کہ بظاہر سب کچھ وہی کا وہی ہے۔ لیکن نہ جانے کیسے یہ افتاد کیا پڑی۔ ڈال پر بیٹھی ایک چڑیا کو بھی غور سے اور تفصیل سے دیکھنے اور اس دید سے محظوظ ہونے کی مہلت باقی نہ رہی۔

اور یہ تو مجھے آج اتنی مدّت بعد چھت پر کھڑے ہو کر احساس ہوا کہ اس گلی کی مجلسی زندگی، چہل پہل اور گہما گہمی واقعی کم ہوگئی۔ جیسے وہ کوئی ایسی فائل ہو جسے کسی

مچھلی

ابھی بس اسٹینڈ تک پہنچی بھی نہ ہوتی کہ ایک ہلچل سی مچ جاتی۔ بس اسٹینڈ کے طویل شیڈ کے ساتھ ساتھ کھڑے لڑکوں کی قطاروں میں اضطراب کی موجیں سی ننھے ننھے ہلکورے لینے لگتیں، اور ایک غلغلہ سا سنائی دیتا۔

آ گئی... آ گئی...

مچھلی آ گئی... مچھلی آ گئی۔ نہ جانے کتنی زبانیں یہ دو لفظ تکرار سے دُہراتیں... اور ساتھ ہی دفتی اور آرٹ پیپر کی قینچیوں کی مدد سے کاٹی ہوئی متعدد مچھلیاں (رنگا رنگ) لمبے لمبے سینٹھوں پر پلے کارڈوں کے انداز میں ننگی ہوئی فضا میں لہرانے لگتیں۔

اور اب میں یہ بات اس وقت سوچ رہا ہوں کہ یہ مچھلیاں ایک دم بروقت نکل کہاں سے پڑتی تھیں۔ اس لیے کہ کالج کے اوقات اور کلاسوں کے دوران تو کبھی کسی لڑکے کے ہاتھ اور کتابوں میں کوئی مچھلی نظر آئی نہیں۔

اور مچھلی ابھی ہم سے کافی فاصلے پر ہوتی۔

اور مچھلی! خود مچھلی کا تو یہ دستور تھا کہ پوری طمانیت، پورے اعتماد سے، ایک کماندارانہ اسلوب سے لڑکیوں کے دستے کی قیادت کرتی ہوئی، نپے تلے قدم ڈالتی بس

اسٹینڈ کی طرف بڑھی چلی آتی، اس شان اور اس انداز سے۔ پانچ فٹ دو انچ لمبا قد۔ سرما میں سیاہ اور موسم گرما میں سفید برف سی سلکی چادر میں سراپا کو لپیٹے۔سفید لٹھے کی کھڑکھڑاتی شلوار، سیدھا ہاتھ قدرے اوپر کی طرف پرچم بردارانہ اسلوب سے فضا میں بلند جس میں نوٹس کی ایک فائل اور ایک آدھی کتاب تھامے بڑھی چلی آ رہی ہوتی۔

کوئی کوئی بدتمیز لڑکا فاصلے کو بتدریج کم ہوتا دیکھ کر اچانک ہی نعرہ زن ہوتا۔ نعرۂ مچھلی... یا مچھلی! یا مچھلی۔'' تمام لڑکے ہم آواز ہوکر جواب دیتے ''یا مچھلی۔ یا مچھلی۔'' ساتھ ہی ایک آدھ اور زیادہ بدتمیز لڑکا ماہیٔ بے آب کے انداز میں تڑپنے پھڑکنے کی ایکٹنگ کرنا شروع کر دیتا۔

وہ آئی... پھر بڑے اسٹریٹجک انداز میں ایک نسبتاً محفوظ زاویے سے اپنے دستے کو فال اِن کرواتی (پیارے قارئین! واضح رہے کہ ابھی لڑکیوں کے کالجوں میں این سی سی کا رواج نہیں ہوا تھا) اور بڑے اطمینان سے بس روٹ کی جانب والی سڑک پر نظریں گاڑ کر کھڑی ہو جاتی... ساتھ...کبھی مونگ پھلیاں، کبھی چلغورے چھیل چھیل کر کھانے لگتی۔ کبھی نظریں جھکا کر اپنے پیروں میں پڑے سیاہ موکاسن کو گھورنے لگتی۔ خاصے عرصے تک تو میں اس بات کا یقین ہی نہ کر پایا کہ اس تمام تر روئے سخن کی مخاطب کون سی خاتون ہیں... اور اس کا ایک سبب تھا...سبب یہ تھا کہ میں نے اس کالج میں چند مہینے قبل ہی داخلہ لیا تھا۔ ہنگامی طور پر...

اور اس داخلے کے پیچھے بھی ایک کہانی ہے۔خیر لمبی نہیں...آپ کہیں تو میں تو سنانے کو بھی تیار ہوں۔

وہ ہوا یوں تھا کہ جب دوسری مرتبہ بھی ایف ایس سی میں ناکام رہا، بالکل تو نہیں البتہ کمپارٹ آئی تو بابا جان نے مجھے بلایا، خاص اپنے کمرے میں۔

خیر میں ڈر تو بہت رہا تھا اس خاص طلبی پر مگر وہ نہایت دوستانہ موڈ میں تھے، کہنے لگے۔

''یار! میں سمجھتا ہوں یہ پڑھنے وڑھنے کی لائن تمہارے بس کا روگ نہیں۔

ویسے میں تو تم کو ابھی بھی اسی حالت میں اپنی بزنس میں لگا لیتا لیکن سوچتا ہوں کہ یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ آدمی تمام عمر کے لیے انٹر گریجویٹ ہی رہ جائے۔ پھر لڑکی والے پوچھیں کہ لڑکے کی تعلیم کیا ہے۔ تو بتاتے بھی شرم آئے... اب بھئی میں بھی کیا کروں تم کو شہر کے بہترین کالج میں داخلہ دلوایا تھا... چلو اب تم ایسا کرو کسی دوسرے، تیسرے درجے کے کالج میں داخلہ لے لو... تاکہ ماحول میں مس فٹ (Miss Fit) رہو گے تو وہاں سے نکلنے کی تدبیر بھی کرو گے۔ ایسا کرو تم آرٹ کے مضامین لے لو... ڈویژن کی بھی پروا نہ کرو۔'' وہ کچھ شرمندہ شرمندہ سے بات کر رہے تھے۔

میں سمجھ رہا تھا۔ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

سو میں نے اس مرتبہ کمپارٹ کلیئر کی تو اس کالج میں داخلہ لے لیا۔ مجھے پتا ہے بابا جان مجھے در پردہ سبق دینا چاہتے تھے کہ دیکھو ایک اندازِ زیست اور طالب علمی کا ایک رنگ یہ بھی ہوتا ہے۔

سو میں بھی چپ چاپ یہ سبق لینے پر آمادہ ہوگیا۔

دل میں تو یہی خیال لے کر آیا تھا کہ بی اے میں آرٹس سبجکٹس لے لیں گے۔ اردو، اسلامیات اور اکنامکس (وہ بھی مشکل لگی تو مضمون بدل کر تاریخ یا سیاسیات کروا لیں گے) مگر یہاں چند اسکول کے ساتھی بی ایس سی میں داخلہ لیتے ہوئے مل گئے... انھوں نے زبردستی سائنس کے مضامین دلوا دیئے... فارم میں... بس یہی کہتے رہے... یار گپ شپ، چاء چو رہا کرے گی۔ آجاؤ ہمارے ہی ساتھ... بڑے دنوں میں تو بچھڑے ملے ہیں۔ تھرڈ کلاس کالج تھا۔ اس کے میرٹ کے مطابق ہمارے مارکس موجود تھے۔ سو داخلہ لے لیا بی ایس سی میں...

شروع شروع میں تو یہی وہم رہا کہ شاید کالج کی اصلی عمارت زیرِ مرمت یا زیرِ تعمیر ہے۔ اس لیے عارضی طور پر آثارِ قدیمہ کی اس عمارت میں ڈیرہ ڈالا ہوا ہے۔ مگر بعد میں پتا چلا کہ یہ ہی کالج کی مستقل اور ابدی قیام گاہ ہے۔ پھر یہی ڈر لگنے لگا کہ کسی وقت کوئی چھت ہی نہ بیٹھ جائے سر پر۔ پھر رفتہ رفتہ یہ ڈر بھی تحلیل ہونے لگا یا

شاید میری ہی تحلیلِ نفسی ہونے لگی۔ان دنوں میں ذاتی گاڑی میں کالج آتا جاتا تھا۔

پھر ایک دن یوں ہوا کہ بابا جان کو کچھ کام تھا۔ کالج کے نواح میں وہیں کہیں۔آس پاس۔ آئے ہوں گے اور انھوں نے ضرور کچھ دیکھا ہوگا... اب میں نے تو پوچھا نہیں لیکن اس دن واپسی پر ان کے کمرے میں طلبی ہوئی۔

پچھلی طلبی کی بنا پر ہیبت اور خوف میں کچھ تخفیف ہوگئی تھی۔

والد صاحب کے کمرے میں بڑے پر اعتماد قدموں سے چلتا ہوا داخل ہوا۔ مگر اس مرتبہ ہوا کچھ مخالف سمت کو جا رہی تھی۔ موڈ کچھ بدلا بدلا تھا۔مجھ سے بیٹھنے کو بھی نہ کہا۔ بلا تمہید ہی بول پڑے۔

یارتم تو ہماری گاڑی کا کباڑا کر دو گے، ستر اسّی پر پانی پھیر دو گے۔

کیوں جی۔ وہ کیسے؟ میں چونکا۔

بھلا وہ کوئی گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ ہے۔(پھر کچھ سوچ کر) لبِ سڑک۔ اور وہ بھی اس انداز کی سڑک کے کنارے گاڑی کون کھڑی کرتا ہے...

سوال پر سوال کیے جا رہے تھے۔

آخر تمہارے پروفیسر بھی تو کہیں گاڑیاں کھڑی کرتے ہوں گے۔

اب میں ہکا بکا ان کا منہ دیکھ رہا ہوں...اس لیے کہ ان دنوں پروفیسر صاحبان عموماً بسوں یا سائیکلوں پر آتے جاتے تھے۔ بعض سینئر حضرات ٹہلتے ہوئے آنا پسند فرماتے تھے اور بعض نوجوان لیکچرار ہونڈا یا سوزوکی پر بھی سواری کر لیتے تھے۔

بہرحال انھوں نے آخری جملہ جو کہا وہ یہ تھا، ''اچھا کل سے گاڑی نہ لے جانا۔تم اب اسکوٹر پر جایا کرو۔''

میں نے ان کا حکم سنتے ہی چابی ان کی میز پر رکھ دی اور خود ہلکا پھلکا باہر نکل آیا۔

میں واقعی مبالغہ نہیں کر رہا... گاڑی کی بندش پر میں خوش ہوا تھا۔ اس لیے کہ کچھ فٹ نہیں بیٹھ رہا تھا اس فریم میں۔عجیب سی پوزیشن میں رہتا۔ خصوصاً جب سینئر

پروفیسروں کو اپنی گاڑی کے قریب پاؤں پیدل چلتے دیکھتا۔ کتنی بار گاڑی روک کر اصرار کرتا۔

سر بیٹھ جائیں... ڈراپ کر دیتا ہوں...

مگر وہ نہایت شفقت اور نرمی سے پیدل چلنے پر اصرار کرتے۔

پھر ساتھ کے لڑکوں کے آگے بھی خود کو ہیٹا ہیٹا سا محسوس کرتا تھا کہ چلے آرہے ہیں ڈبے میں بڑی حفاظت سے بند۔

اور اب جو آزادی ملی تو ہونڈا بھی نہ لیا، مزے سے بس پر آتا جاتا...اور مجھے اب سرما کی دھندلائی ہوئی صبحوں میں بس میں کھڑے کھڑے ٹھنڈی یخ بستہ، اور گرمیوں کی دوپہروں میں بس میں دیوانہ وار گھستے ہوئے لو کے جھونکے اور تھپیڑے ایک عجیب توانائی اور قوتِ برداشت فراہم کرتے تھے۔

تو چنانچہ بس کی رعایت سے لباس میں بھی تبدیلیاں آئیں اور اب میں بلاتکلف اور پورے حق کے ساتھ لڑکوں کے درمیان اٹھتا بیٹھتا، اور اسٹینڈ پر کھڑا ہوتا۔

ہاں تو وہ مچھلی کے بارے میں کتنے دن تو حیران ہی رہا۔ لیکن بعد میں جب نشان دہی کے بعد پتا چلا تو میں حیران رہ گیا کہ کوئی لڑکی اس حد تک بھی مچھلی ہوسکتی ہے۔

یوں تو پوری کی پوری لڑکی ہی تھی۔ مگر چہرہ، دہانہ اور ان کی رعایت سے آنکھوں کا تاثر... اف خدا...

میری تو ہنسی ہی چھوٹ گئی۔ ہمارے کئی ایک پروفیسر صاحبان اور لیکچررز... ہمارے ساتھ ہی بس اسٹینڈ پر اپنے اپنے روٹ کی بس کے انتظار میں کھڑے ہوتے اور ساتھ کھوکھے میں بلاضرورت ہی پان سگریٹ، ٹھنڈے مشروبات کی بوتلیں خریدتے رہتے تھے۔ اس لیے میرے لیے اپنی بے تحاشا ہنسی کو روکنا ضروری تھا۔

''ایسا نہ ہو ان میں سے کوئی پوچھ ہی بیٹھے کس واسطے اتنے بے تاب ہو کر ہنس رہے ہو۔''

مگر بلا کا تحمل تھا مچھلی میں، چند دن تک تو مجھے یہی خیال رہا کہ اس کو علم ہی نہیں کہ یہ سب کچھ اس کے اعزاز و استقبال میں ہوتا ہے۔

لڑکے تو روز ہی نت نئی حرکتیں کرتے۔ کبھی ہرا سمندر گوپی چندر... بول میری مچھلی کتنا پانی... کورس میں گانے لگتے۔ مگر اس پر کسی قسم کا ردِعمل ظاہر ہی نہ ہوتا۔

ایک دن تو ایک ہونق سے لڑکے نے حد ہی کر دی۔ ایک سالم اور کچا کھگا جو کم بخت نے صبح سے نہ جانے کہاں چھپائی ہوئی تھی، بڑے نیازمندانہ انداز میں دونوں ہتھیلیوں پر (اس طرح جیسے کوئی طشت میں رکھے) سجا کر نہایت نیازمندانہ انداز میں پیش کی۔ اور بس میں کیا کہوں... کس تمکنت، کس وقار سے شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے اس نے مچھلی اٹھائی اور پلاسٹک کی اس تھیلی میں لپیٹ لی جس میں وہ دوکنوں اور مٹھی بھر مونگ پھلیاں ڈال کر لائی تھی... اور یہ وہ لمحہ تھا جب ہمارے ایک پروفیسر صاحب نے کوکو کولا کی بوتل ابھی منہ سے لگا کر گھونٹ ہی بھرا تھا... کہ ایک پھرر... کے ساتھ انھوں نے ساتھ کھڑے لڑکوں پر چھیڑکاؤ سا کر دیا۔

تب اس دن مجھے احساس ہوا کہ یہ حضرات نہ صرف اس اپی سوڈ (Episode) سے آگاہ ہیں بلکہ کسی نہ کسی حد تک... خیر تو میں نے اس وقت یہ بھی نوٹ کیا کہ بالکل اس کے ساتھ کھڑی لڑکی نے ٹہوکا مار کر دھیرے سے کہا۔

''یہ کیا حرکت! بھلا کیوں لے لی... اب کم بخت اور سر چڑھیں گے۔ حوصلے بلند ہو جائیں گے ان کے...''

خاصی سنائی دینے والی آواز میں اس نے جواب دیا۔

''اب سر چڑھنے میں کوئی کسر چھوڑ دی ہے۔ اب اور کتنا حوصلہ پائیں گے... جب ایک چیز مل رہی ہو تو اسے قبول کر لینے میں کیا حرج ہے۔''

اس نے عجب دبدبے اور بے نیازی سے جواب دیا۔ اور میں تو بس اسی دن سے اس کا قائل ہوا۔

وہ نری مچھلی تو نہ تھی اس کے اندر تو ایک بڑا توانا اور ہر قسم کے کومپلکس سے

آزاد ذہن موجود تھا۔

پھر میں نے کچھ ہی دن بعد ایک مرتبہ اسے اپنی ساتھی سے یہ کہتے بھی سنا تھا... ''ہاں اس حقیقت کو تو فیس (Face) کرنا ہی پڑتا ہے۔ پہلے تو مجھے اتنا احساس نہ تھا لیکن اب واقعی آئینہ دیکھوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے...''

''ہاں تو اور کیا۔ اب تو ان کم بختوں نے تیری اتنی برین واشنگ کر دی ہے کہ تو اپنے آپ کو مچھلی ہی نظر آتی ہوگی۔''

دوسری والی خاصے جلال میں تھیں...لیکن میں اس خاتون کی شخصیت کو مکمل طور پر تسلیم کر چکا تھا جو نہایت خوش طبعی سے ہنستے ہوئے اور بڑی بے فکری سے کہہ رہی تھی۔

''اگر سچ پوچھو تو غور سے دیکھنے پر یہ احساس ہوتا ہے کہ ہر انسان میں کسی نہ کسی جانور کی تھوڑی بہت مشابہت ضرور ہوتی ہے...شکر ہے کہ مچھلی ہی...

بس میں اتنا ہی سن پایا تھا۔ اس لیے کہ میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ کئی لڑکوں کے ایک غول نے پُر کر دیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ اتنے دنوں بعد یکایک مچھلی کا خیال کہاں سے ابھر آیا...تو یہ بات نہیں ہے۔ یہ خیال اکثر بیٹھے بیٹھے آجاتا تو میں بلا سبب اور بلا جواز ہی ہنسنے لگتا، کھلکھلا کر۔

دراصل میں نے کالج میں یہ داخلہ تو ایک بالکل ہی غیر سنجیدہ موڈ میں لیا تھا...اور جیسا کہ والد صاحب نے کہا تھا کہ یہ پڑھنا پڑھانا تمہارے بس کا روگ نہیں۔ تو اپنا حال بھی یہی تھا...مگر وہ جو کہتے نا کہ خدا جھکی آدمی سے بچائے...تو اپنے کو بھی بس ایک ایسے ہی جھکی پروفیسر ٹکر گئے کہ مضمون ان کا بوٹنی، بائیولوجی تھا...مگر وہ تو دنیا کے ہر موضوع پر فر فر بے تکان بولتے تھے...کمبل بن کر چمٹ جاتے تھے۔شاگردوں کی جانوں کو بالخصوص جن پر مہربان ہوجائیں، دماغ چاٹ لیتے تھے...اور اتنا بے ارادہ بنا دیتے تھے اگلے کو کہ اب وہ ان کے ارادے کے ساتھ ساتھ چلنے پر مجبور ہوتا تھا۔

اب یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ کس بنا پر، لیکن ان کی نظر کرم خاکسار پر بھی جمی... اور چمٹ گئے کمبل بن کر... اب دیکھیے بلا ارادہ ہی ان کی جھک ایک متعدی مرض کی طرح اندر اترتی چلی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بی ایس سی میں ٹاپ کلاس نمبر لیے...خیال تھا...کہ یہ مرحلہ طے ہوگیا تو نہ ہم ہوں گے نہ یہ کمبل...مگر الٹا حساب یہ ہوا کہ وہ تو تھے ہی کمبل کہ میں بھی کمبل بن گیا۔اب نہ وہ ہمیں چھوڑتے تھے اور نہ ہم ان کو۔لاچار ان ہی کے مضامین میں ایم ایس سی کی فرسٹ کلاس ڈگری بھی مارلی۔

میں کبھی کبھی امریکا میں بھی ان کے بارے میں سوچ کر ہنسنے لگتا تھا۔ گٹوں سے اونچی پتلون (جی ہاں ان کی برینڈ نیو پتلونیں بھی گٹوں سے اونچی ہی ہوتی تھیں) فرماتے تھے کہ تھوڑا بہت تو شروع کا خیال رکھنا چاہیے (بڑے فخریہ کہا کرتے تھے یہ شرعی پتلونیں ہیں) سردیوں میں چیک کا ایک ہی کوٹ (جا بجا سے گھسا ہوا) نہ جانے کب سے پہنتے چلے آتے تھے۔لڑکوں کا کہنا تھا یہ کوٹ رات کو بھی ان کی جان سے لگا بستر میں جاتا ہے۔سیدھے ہاتھ کی اگلی دو انگلیاں سگریٹ نوشی کی کثرت کے باعث زرد، نقل سماعت اور چشمے کے فٹ نہ ہونے کی اکثر شکایت کرتے رہتے تھے۔ مگر ہمارا تجربہ کہتا تھا یہ قطعی ٹونے نہیں بلکہ بہرے پن کے وہم میں مبتلا ہیں۔ اس لیے مطلب کے سارے سوال جواب گوش گزار ہو جاتے ہیں۔ گم گشتہ سا، لاابالی مزاج۔ ہم سب انھیں پروفیسر کمبل کہتے تھے...پڑھاتے کیا تھے اندر ڈرل کر دیتے تھے۔ نکتہ نکتہ رگ وپے میں بٹھا دیتے تھے۔

ان کا خیال آتا تو آثارِ قدیمہ کے کنبے کی وہ ہر لحظہ ڈھے جانے اور سر پر آگرنے کی دھمکیاں دیتی کالج کی عمارت۔ مریل سی کینٹین، ہونق سے لڑکے اور بس اسٹینڈ کے معرکے بمعہ مچھلی سب ہی ذہن میں تازہ ہو جاتے۔

وطن واپسی پر ہر شریف اور سیدھے سادھے آدمی کی طرح وہی انجام ہوا جو ہونا تھا۔ وہی کاروبار، گھر بار، بال بچے...غرض ایسے الجھے ایسے الجھے کہ ہر بات سے ہر یاد سے دور ہوتے چلے گئے۔

اور اب جو حال رہ گیا ہے وہ کچھ یوں ہے۔ بیوی کہتی ہے۔ چلو چائنیز چلتے ہیں تو ہم بن ٹھن کر اسٹیرنگ پر جا بیٹھتے ہیں۔ ہاں چلو چائنیز چلیں۔ وہ کہتی ہے جمعہ بازار جانا ہے۔تو میں یہ نہیں کہتا کہ ہم جمعہ بازار جا کر کیا کریں گے۔ اللہ کے فضل سے گراں سے گراں چیز خرید لینے کی استطاعت ہے۔ مگر قصہ یہ ہے کہ جمعہ بازار ان دنوں جدید ترین اسٹائل اور فیشن بن چکا ہے۔ پھر اب ملک میں سیلوں اور لوٹ سیلوں کا اتنا رواج ہوگیا ہے۔ کہتے تو ہیں کہ یہ عوام کی سہولت کے لیے لگائی جاتی ہیں۔ لیکن رش بنانے والی ہماریاں بیگمات ہوتی ہیں۔ میری بیوی چونکہ آزادی اور سر بلندیِ خواتین کی رکن ہے۔ اس لیے وہ میل شاو نزم (Male Chavanism) کو توڑنے کے لیے اصرار کرتی ہے کہ میں نہ صرف اس کے ہمراہ چلوں بلکہ سب سے چھوٹے بچے کو اٹھا کر چلوں۔

کبھی کبھی میں سوچنے لگتا ہوں کہ یار تمہارے وجود کا اور کوئی مصرف نہیں۔ تم اسی لیے پیدا ہوئے، سیلوں اور لوٹ سیلوں میں لیے پھرو۔ اب میں تو پیسے کے اصراف کا بہانہ بھی نہیں بنا سکتا، کہ ہمارے گھر میں پیسہ کوئی مسئلہ نہیں۔ مگر بندے کو یہ سوچنے کا تو حق ہے کہ یار میرے پیسے کا اور کوئی مصرف نہیں ہوسکتا...

''تم مجھے پہلے بھی کراؤڈ ہجوم...اور غل فل میں ملی تھیں۔ یااللہ اب اتنے دن کے بعد... پتا ہے کتنے برس گزر گئے ہیں۔ پورے دس سال... اور وہی مچھلی کی مچھلی... وہی مچھلی کا تاثر لیے گپ چپ سیاہ آنکھیں۔

مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں سیل میں نہیں، بس اسٹینڈ پر کھڑا ہوں اور وہ اپنے دستے کو اپنی قیادت میں مارچ کراتی آ کھڑی ہوئی۔ لیکن آج دستے کی بجائے ایک عدد اس کے بازوؤں میں محفوظ تھا۔ ایک اس کا پلو پکڑے، انگوٹھا منہ میں لیے اس کے ساتھ ساتھ گھسٹ رہا تھا۔ ایک نو دس سال کی نازک سی، نخریلی سی لڑکی اس کو Dominate کر رہی تھی۔ اس کے اپنے چہرے پر متوسط درجے اور حیثیت کی ہاؤس وائف کا تاثر تھا۔ وہ پورے دھیان سے، اپنے بچوں کی فرمائشوں، اپنی ضرورت اور اپنی

جیب کی تنگی میں توازن قائم کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ ایک لمحہ میں نے اپنی شناخت کو معتبر بنانے میں صرف کیا۔ اور دوسرے لمحے اپنی شناخت پر اعتبار کیا۔ اعتبار کیوں نہ کرتا۔ میں نے پورے تین سال اس کو اپنے آپ سے چند انچوں یا زیادہ سے زیادہ ایک فٹ کے فاصلے پر کھڑا دیکھا... پھر بتدریج اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے کی منزل سے نکل کر چاہنے کی حدود میں داخل ہوا اور پھر چھ ماہ تک اس سے ڈٹ کر محبت کی تھی۔ اتنی کہ آخر ایک دن اس کو اپنے ساتھ بھاگ چلنے کی دعوت دے ڈالی... اس دعوت نامے کو شرفِ قبولیت بخشنے سے پہلے اس نے صرف دو دن سوچنے کی مہلت مانگی تھی۔ دراصل وہ ان دنوں اپنے آنے والے عائلی مستقبل کے آثار و کوائف سے سخت بیزار اور ہراساں تھی۔ چنانچہ میری درخواست پر ہمدردانہ غور کرتے ہوئے، قبولیت کی توثیق کرتے ہوئے جو مکالمہ کیا، وہ کچھ اس طرح تھا:

''سنیے میں تیار ہوں۔'' پھر وہ کچھ رکی اور جھکی۔ پھر گھٹی گھٹی آواز میں جھجکتے ہوئے بولی۔

''دراصل آج کل والدہ صاحبہ میرے لیے چند ایسے رشتوں پر غور فرما رہی ہیں کہ میرے لیے ان رشتوں کو قبول کر لینا بقائمی ہوش و حواس ممکن نہیں۔ اور اس لیے میرے اوپر سخت ڈانٹ پھٹکار ہو رہی ہے۔ سوچتی ہوں اس سے تو بہتر ہے کہ آپ کی تجویز نامعقول ہونے کے باوجود منظور کر لوں۔'' تب وہ ایک دم سہم کر بولی، ''سنیے آپ مجھے لے کہاں جائیں گے! سیدھے اپنے گھر؟؟''

واقعی میں نے تو یہ بالکل سوچا ہی نہ تھا... میں تھوڑا سا بدحواس ہوا... کہ وہ خود ہی بولی...

''اگر تو آپ مجھے اپنے گھر لے جائیں گے تو وہاں تو اور بھی ڈانٹ پھٹکار کا سامنا ہوگا... اور یہ ڈانٹ پھٹکار میں بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔ بس جی چاہتا ہے منہ اٹھا کر کہیں بھی چل دو۔ پھر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ گھر ہی میں...''

میں تو جی ہی جی میں یہی ڈر رہا تھا کہ وہ سیدھا گھر لے جانے پر بضد نہ ہو

نے سرخ فیتے سے باندھ کر فائلوں کے انبار تلے گم کر دیا ہو۔

گرما کی تاروں بھری راتوں میں یہ گلی (جسے بستی کے آخری نکڑ پر رہنے والا بوڑھا سقہ اپنی مشک سے چھڑک کر خنک کر دیا کرتا تھا) کتنی آباد ہو جاتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے گھروں کی گھٹن اور حبس سے گھبرا کر محلے کے لوگ (بستی یعنی کچی آبادی والے) باہر نکل آیا کرتے تھے۔ کیسی رونق اور گہما گہمی ہو جاتی۔ ہنسیاں، دل لگیاں، آپس کی چھیڑ چھاڑ، اسٹریٹ لیمپ تلے بیٹھ کر تاش کی، لوڈو کی بازیاں۔ یہ سب کتنا دلچسپ میورل تیار کرتا تھا۔

لیکن اب ایسے میورل بننا بند ہوگئے۔ لگتا ہے مصور کے رنگوں کی ساری پیالیاں خالی ہوگئیں، تمام رنگ خشک ہوگئے۔

میں یہ نہیں کہتی کہ یہ سب اس لیے ہوا کہ گھروں میں پنکھے لگ گئے، بلکہ بعضے بعضے گھروں میں کولر اور ان سب سے بڑھ کر ائیرکنڈیشنر بھی لگ چکے ہیں اور بوڑھے سقے نے اپنی مشک سے گلی کو چھڑکنا بھی بند کر دیا ہے (کہتے ہیں اس کی بیوی نے لوگوں کی بدحالتوں سے مقابلہ کر کے اس کو حسد میں مبتلا کر دیا ہے۔ اور اب وہ اپنے ہمسایوں کو دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہے اور وہ بھی اتنے اونچے ہوئے کہ سلام مسنون میں سبقت سے بھی گئے) بہر حال اب کوئی گلی میں ہوا کھانے کی خاطر نہیں نکلتا۔

اور اندر گھروں میں وی سی آر پر ناقابلِ بیان تصویریں پھڑکتی ہیں۔ بظاہر یہ بہت چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں تھیں جو وقت کے تغیرات کا خوش کن لازمہ کہی جا سکتی ہیں۔

وقت جو حادث ہے، وقت جو تغیر پذیر ہے۔

اور وقت کا شکوہ کسی طور پر ہم پر لازم نہیں۔

کہ اس فعل سے ہم کو منع کیا گیا ہے۔

اور پھر سب کے نزدیک تو یہ شکوے کی بات ہی کوئی نہیں۔ ہاں البتہ اس کی بات اور ہے جس کی نظر سامنے پرس پیکٹو (perspective) تو رہ گیا ہو اور منظر غائب ہو۔

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

جائے۔ یہ سنتے ہی میں تو ریلیکس ہوگیا۔

اچھا پہلے تو... پہلے تو... زبان لڑکھڑا رہی تھی...

پہلے پہلا قدم تو اٹھائیں، پھر وہ بھی دیکھ لیں گے۔

(اور اب بریکٹ میں یہ بات سوچتا ہوں کہ مجھ پر کیسا بھوت سوار ہوگیا تھا۔ اور اگر وہ پہلا قدم اٹھا ہی لیتی... تو... تو... میں کیا کرتا۔ یقین جانئے ابھی بھی میری ٹانگیں لرز رہی ہیں)

بہر حال اس کو دیکھ کر یوں بھی خوشی ہو رہی تھی۔ بہر حال مجھے اپنی شناخت پر مکمل اعتماد تھا... میں آگے بڑھا۔

ہیلو! مچھلی! (جو لفظ میری زبان سے اس کے لیے کبھی نہ نکلا تھا وہ خود بخود وارفتگی میں نکل گیا)... تم... تم مچھلی ہونا! اگرچہ سیل کی خریداری میں مصروف خواتین اتنی بے اوسان ہو رہی تھیں کہ ان کے پرس چوری ہو رہے تھے، بٹوؤں میں سے رقمیں اڑائی جا رہی تھیں... تاہم سیلز مین نے مجھے چونک کر دیکھا (شاید اسے میری ذہنی صحت پر شبہ ہوا) اسی دم اس کی نظر اس پر پڑی۔ اس نے سر جھکایا۔ زیرِ مونچھ مسکرایا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

میری آواز پر وہ خشم آلود نگاہ لیے میری جانب مڑی، ایک لمحہ اس نے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی حدت، اور خشم نرم نرم جیونی بن گیا... اور میں اس نرم نگاہی کی برکھا میں بھیگنے لگا۔

''ارے کتنا بدل گئے ہو... میں تو پہچان ہی نہ پائی۔ مونچھیں جو اتنی گھنی رکھ لی ہیں''... نگاہوں کی جوت میں اور بھی نرمی اور خنکی آگئی تھی... مسکرائی اور بولی۔

''اچھے لگ رہے ہو۔''

لگ رہا ہوں نا...؟ پر تم اپنے آپ کو دیکھو ذرا بھی نہیں بدلیں...

کھن سے وہ ہنس دی (اس کی ہنسی کا یہی انداز تھا، جیسے سونے کے دو موٹے موٹے کڑے آپس میں ٹکرا کر بج اٹھیں... کھن سے)

ہاں دیکھو! وہی مچھلی کی مچھلی...

اس نے گود کے بچے کو سنبھالا۔ پلاسٹک کے گھٹیا سے تھیلے میں سے بوتل نکال کر اس کے منہ میں ٹھونس دی۔

''یہ بچے تمہارے ہیں...'' میں نے بارہ تیرہ سال کی پیاری سی، موہنی سی لڑکی اور اس کی انگلی سے لگے ہوئے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

''تو اور کیا محلے والوں کے ہیں۔'' وہ ہمیشہ کی سی سادگی سے مسکرائی۔

ویسے میں نے جھوٹ کہا تھا، اس کا دل رکھنے کو۔

وہ کافی بدل گئی تھی۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ آنکھوں میں وہ قوسِ قزح، خوابوں کی وہ دھنک نہ تھی جو بن بیاہی کنواری آنکھوں کا سنگھار ہوتی ہے... پھر ان کالی گھٹا بالوں میں جا بجا سفید دھاگے سے چغلی کھاتے تھے، جیسے کسی نے کالے ڈوپٹے کے آنچلوں میں سفید دھاگے سے شلنگے مار دیئے ہوں۔ پیروں کا سینڈل بزبانِ خود بتا رہا تھا کہ لوہاری کی کسی تھڑے ٹائپ دکان سے لیا گیا ہے اور اس کی خریداری کی مدت پر سے کئی کلنڈر گزر رہے ہیں۔ سب سے بڑھ کر سینڈل سے نکلی ہوئی اس کی ایڑیاں پھٹ رہی تھیں اور دراروں میں میل چمکتی تھی۔

کم حیثیت خاتونِ خانہ کی مخصوص پہچان اور مقدر... وہ سستے سے پرنٹ کے ملگجے سے شلوار کرتے میں میرے سامنے کھڑی تھی۔

اور میں! میں خود اس سوٹ میں اس کے مقابل کھڑا تھا جو پہلے ٹرپ پر ہم نے پیرس میں سلوایا تھا۔

زندگی کی دوڑ میں وہ پہلے بھی کچھ آگے نہ تھی اور اب تو بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ اب میرا اس سے کوئی مقابلہ ہی نہ رہ گیا تھا۔ پھر بھی میں نے ملامتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہو بڑی جھوٹی... پتا ہے اس مقررہ تاریخ کو میں شام پانچ بجے سے گیارہ

بجے رات تک بس اسٹینڈ پر کھڑا انتظار کرتا رہا۔ایمان سے اتنا احمق اور ہونق لگ رہا تھا... لوگ خاص طور پر بس اسٹینڈ کے ساتھ کے کھوکھے والے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔''

اس سیل... بلکہ لوٹ سیل کے سیلِ رواں میں مربوط اور مسلسل گفتگو تو انسان کے بس کی بات نہ تھی، پھر بھی بچوں کے کپڑوں کے ایک گوشے میں کھڑے ہو کر میں نے شکوہ شکایت کا موقع تلاش کر ہی لیا۔

''اچھا...'' ایک چھوٹے سے سوئیٹر کو بغور دیکھتے دیکھتے اس نے بے دھیانی سے کہا۔''اتنی دیر!... بھلا کیوں کھڑے رہے؟'' اب وہ میری طرف گھوم چکی تھی۔

تو اور کیا کرنا تھا... اور جو تم آ ہی گئی ہوتیں... اور میں غائب ہوتا... تو... اس وقت کیا ہوتا۔

''واقعی! ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ چچ...چچ۔ سوری۔''

''اب تم نے تو سوری کہہ دیا۔لیکن میری سوچو۔''

چھ بجے...سات بجے... اور پھر گیارہ تک بجتے ہی چلے گئے۔اتنے عرصے بعد بھی یہ بتاتے ہوئے میری آواز میں غصہ اور شکایت تھی۔ مجھے خود تعجب ہو رہا تھا...

''اور پتا ہے۔میں نے... (میں کہتے ہوئے ڈر رہا تھا۔پتا تھا ناراض ہوگی سن کر)میں نے گجرے خریدے تھے... پھر جب مایوس ہوگیا تو میں نے گجرے بس اسٹینڈ کی بنچ پر رکھ دیے۔ اور گھر چلا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی امی جان نے سوال کیا۔''تم تو کہہ گئے تھے کہ ہفتہ بھر کو گجرات جا رہا ہوں؟''

''امی جان! بس مس ہوگئی۔'' یہ کہتے ہوئے میں کھٹا کھٹ زینہ چڑھتا ہوا اپنے کمرے میں جا پہنچا۔

تم...تم...تم نے گجرے خریدے... لاحول ولاقوۃ... اتنی چیپ نس...میں...میں... تم کو گجرے پہننے والی عورت نظر آتی تھی... ان آنکھوں سے وہ خنک خنک مدھر جیوتی ایک دم الجھ گئی تھی... اور ان میں ملال کی دھول ہی دھول نظر آتی تھی۔ میں سٹ پٹا گیا۔

''تم سے تو وہ بدتمیز لڑکے عقل مند تھے جو میرے آگے زندہ پھڑکتی مچھلیاں پیش کرتے۔ اور چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کے ہار بنا کر دکھایا کرتے۔''

ناراضگی کی یہ کھنک اس کی آواز میں میرے لیے نئی تھی۔

اس کی آواز تو بڑی ٹھنڈی اور ٹھہری ٹھہری تھی۔

میں واقعی احمق ہی تھا اور اپنی حماقت پر شرمندہ۔ اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

''ارے سنو تو!... بھئی میں سمجھتا تھا کہ ایسے موقعے پر...''

میں واقعی رنجیدہ ہوگیا تھا۔

وہ بڑی نرم خو تھی، کسی کو دکھ دینا جانتی ہی نہ تھی۔ اس کی یہی ادا تو مجھے کھا گئی تھی۔ فوراً بات پلٹ کر خود صفائی پیش کرنے لگی تھی۔

''پتا ہے میں نے تم کو دھوکا تو نہیں دیا تھا۔ سچ کہہ رہی ہوں۔ بالکل تیار تھی، میں نے تو اپنا سفری بیگ بھی پیک کر لیا تھا۔ اور کپڑے بدلنے ہی کو تھی کہ خیال آیا کہ پتا نہیں اس دن تم نے مجھ سے گلابی کپڑے پہننے کی فرمائش کی تھی کہ کاسنی؟ ایک ہی تو فرمایش کی تھی اتنے دنوں میں... گلابی... کاسنی... کاسنی... گلابی...؟ بس یہی دو رنگ میرے اندر سوال بن کر اندر ہی اندر چکر کاٹ رہے ہیں... اور یقین کرو، میں نے دونوں جوڑے نکال کر پاس پاس رکھ دیئے تھے۔ آتے جاتے جیسے ان ہی سے سوال کرتی تھی، کاسنی؟ کہ گلابی؟ یہ چکر نہ پڑ جاتا تو میں تو وقت سے پہلے ہی پہنچ گئی ہوتی۔ پھر میں نے سوچا کہ چلو ٹاس کر لیتے ہیں۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموشی ہوگئی۔ اور اب اس کا دہانہ بالکل مچھلی کا تاثر دے رہا تھا۔ اس کی لڑکی اس کے قریب آکر کسی چیز کی خریداری کا اشارہ کر رہی تھی۔

وہ اس کے قریب ہو کر سرگوشی میں بولی، ''پیسے ختم ہوگئے ہیں پھر لے لینا۔''

پھر اس نے میری طرف دیکھا، ''انکل کو سلام کرو نگی۔''

میری مشکل اس نے حل کر دی تھی۔ اب میں نگی کی موجودگی میں اس سے سوال کر سکتا تھا، ''ٹاس؟''

عجیب سی احمقانہ روداد تھی، لیکن مجھے عجیب مزا دے رہی تھی۔ جیسے سارا وقت دس بارہ سال کا، یہ تمام عرصہ جست مار کر کہیں نکل گیا ہو... اور میں اس کالج والے بس اسٹینڈ پر کھڑا ہوں۔

''ہاں... ٹاس۔'' ایک دم ہی وہ ذرا نروس سی ہوئی۔

''سنو... دیکھو، وہ خاتون جو اس طرف کھڑی ہیں شاید تمہاری واقف ہیں، تمھیں بڑے غور سے دیکھ رہی ہیں۔''

''ارے عقل مند واقف نہیں، وہ میری بیوی ہے۔''

''ارے تمہاری شادی ہوگئی ہے؟''

''تو تمہارا کیا خیال ہے میں ابھی تک بس اسٹینڈ پر گجرے ہاتھ میں لیے کھڑا ہوں۔''

''اچھا تو یہ تمہاری اپنی بیوی ہے، اتنی اسمارٹ، اتنی گریس فل۔ چلو جھوٹ نہ بولو۔''

''اچھا تو میں اس کے قابل نظر نہیں آتا... چلو تمہارا اس سے تعارف کرواتا ہوں۔''

''ارے نہیں... نہیں ذرا میرا حلیہ تو دیکھو... کہاں وہ اور کہاں میں''...

اب وہ بالکل ہی مچھلی نظر آنے لگی۔

سکندرہ خود ہی ٹہلتی قریب آگئی... مجھے نہیں یقین کہ اس نے تعارف غور سے سنا بھی تھا... تعارف سنے بغیر ہی اپنا پنجہ بلکہ یوں کہیے کہ خوب صورتی سے تراش پر نوکیلے بنائے ہوئے کیوٹیس میں ڈوبے ناخنوں کی نوکیں اس کی انگلیوں سے چھوائیں... خواتین کے سیلاب میں گم ہوتے ہوتے مڑ کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''سنیے، اگر آپ بور ہو رہے ہوں تو فی الحال گاڑی لے جائیں۔ ٹھیک دو بجے ڈرائیور سے کہیں لے آئے۔ آج یہاں کراکری کے بڑھیا بڑھیا سیٹوں کا آکشن ہوگا ایک بجے کے بعد۔''

''اپنے گھر کراکری نہیں ہے کیا... اور کیا ہم نیلام میں ہی کراکری لے سکتے ہیں۔ یہ موقع ان کے لیے چھوڑ دو جو نہیں خرید سکتے۔'' میں نے کہا...

''فضول باتیں نہ کریں...'' وہ تیزی سے دوسرے ڈیپارٹمنٹ کی جانب مڑگئی۔

''اچھا پھر میں اس کو اس کے گھر ڈراپ کرتا جاؤں؟''

''ضرور!'' وہ اس کو میری کوئی دور دراز رشتے کی پس ماندہ کزن سمجھ رہی تھی۔

''چلو میں تم کو تمہارے گھر چھوڑ دوں گا۔''

اس کو یہ آفر غنیمت لگی۔ جلدی جلدی اس نے بچے سمیٹے، کاؤنٹر پر جاکر ادائیگی کر کے تین چھوٹے چھوٹے پیکٹ اٹھا کر اپنی گھٹیا سی پلاسٹک کی ٹوکری میں ڈالے... اور باہر نکل آئی۔

بچوں کے ساتھ وہ پچھلی ہی سیٹ پر ٹھس کر بیٹھ گئی میں نے کہا، ''اگلی سیٹ پر آجاؤ تو کیا ہرج ہے میں تم کو کھا تو نہیں جاؤں گا۔''

وہ اٹھ کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بچوں کو آئس کونز دلوا کر میں نے سوال کیا۔ تو ہاں پھر تم تو ٹاس کرنے لگی تھیں۔

''اب کیا کرید ہے، گئی گزری باتوں کی...'' وہ ہنسی... پھر کہنے لگی، ''ابھی میں نے سکہ ہاتھ میں پکڑا ہی تھا کہ ایک غلغلہ، ایک شور اٹھا۔ باہر نکل کر دیکھا... تایا جان اپنی فیملی سمیت آنگن میں کھڑے تھے... ساہیوال سے بلااطلاع ہی پہنچے تھے۔ ہر سال ہم جاتے تھے۔ اس سال چھٹی گزارنے وہ آگئے۔ اب تمھیں تو شاید پتا بھی نہ ہو ہمارے جیسے گھروں میں ملازم تو ہوتے نہیں۔ نہ مہمان خانے اور نہ ڈھیر سارے کمرے سجے سجائے کہ مہمان آئے اور مزے سے آرام کرے... یہاں تو کچھ کرنا پڑتا ہے، جگہ بنانی پڑتی ہے (وہ بڑی شان سے کہہ رہی تھی) اصل تو میزبانی ہم کرتے ہیں۔ اماں جی چھوٹے بھائی کو سبزی گوشت اور نہ جانے کیا کچھ لینے دوڑا چکی تھیں۔ مجھ سے چھوٹی بہن اور آپی... ہماری کزنز کے ساتھ مل کر بکسے ٹوکریاں اور تایا جان کا حقہ اندر لے جا رہی تھیں۔ گھر میں کیسی گہما گہمی آگئی تھی۔ پورا گھر ہنسی اور محبت بھری باتوں سے بھر گیا

تھا۔ اور ہمارے گھروں میں ہوتا ہی کیا ہے۔ نہ نام نہ نمود نہ قالین نہ سازو سامان، بس محبت، سلوک، ہنسیاں اور قہقہے، بے تکلفی اور ہمارے ساتھ تو یہ ہے نا کہ تایا جان کی ایک ایک لڑکی ہم تینوں کی ہم سن ہے... وہ آجائیں تو نہ دن دن رہتا ہے نہ رات رات۔ باتیں، شرارتیں، چھیڑ چھاڑ، گپیں، تاش، کیرم کی بازیاں لگ رہی ہیں، چائیں تیار ہو رہی ہیں۔ گنے چوسے جا رہے ہیں۔

مجھے کچھ خیال ہی نہ رہا، ذاتی پروگرام ہی دماغ سے نکل گیا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ ہمارے آنگن میں شام اتر رہی تھی۔ صحن کی دیوار کے ساتھ ساتھ لگی موتیے کی جھاڑیوں میں موٹی موٹی سفید کلیاں چمک رہی تھیں۔ بے دھیانی میں پائنچے چڑھا لیے۔ آنگن کے کونے والے نلکے میں پائپ لگا کر میں چھڑکاؤ کرنے لگی۔ جو جو پانی کی پھوار پڑی کچے صحن کی بھوری مٹی کالے پن سے بدلنے لگی۔ عجیب سوندھی سوندھی مہک تھی کہ میرے اندر اترتی چلی جاتی تھی۔ موتیے میں پانی لگنے سے کلیاں چٹکیں تو مٹی کے سوندھے پن میں موتیے کی مہک رل مل کر طوفان سا مچانے لگی۔

گڈو نے بان کی چارپائیاں ساتھ ساتھ لاکر ڈالنا شروع کر دیں۔ آپی اور تایا جان کی بڑی بیٹی ان پر جھٹا جھٹ اجلے اجلے بستر پھیلاتی جا رہی تھیں۔ ایک دم ہی یاد آیا۔ تم بس اسٹینڈ پر آگئے ہوگے۔ مغرب کی اذان ہونے لگی۔ ابو جان نے دالان کی بتی جلا دی اور دونوں بھائی سروں پر سفید ٹوپیاں منڈھ کر مسجد کو جانے لگے۔ میں تیار ہونے کے خیال سے اندر جانے لگی۔ باورچی خانے میں امی جان اور تائی جان پیڑھیوں پر بیٹھی باتوں کے ساتھ ساتھ کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ آلو گوشت کے سالن کی خوشبو سارے آنگن میں پھیل رہی تھی۔

میں نے دونوں جوڑوں کو دیکھا۔ اب بھی کچھ یاد نہ آرہا تھا۔ ایک بار سکہ پھر پکڑا کہ ایک دم نظر باہر کو گئی۔ آپی اور ان کے برابر والی صحن میں پلنگ پر پاس پاس بیٹھی ایک دوسری کی چوڑیاں دیکھ رہی تھیں۔ گڈو اپنی ساتھ والی کے ساتھ موتیا کی کلیاں اتار رہی تھی۔ دونوں ہار پرونے میں جانے کون سی دلچسپ داستانیں ایک

دوسرے کو سنا رہی تھیں۔ میرے ساتھ والی چپ چاپ ایک طرف کھڑی آسمان کو تک رہی تھیں۔ عجیب سا احساس ہو رہا تھا مجھے پتا تھا کھانے کے بعد سارے بہن بھائی بڑے کمرے میں جمع ہوں گے۔ سال بھر کی رکھی سنبھالی باتوں کے دفتر کھل جائیں گے۔ بیت بازیاں اور پہیلیاں چلیں گی۔ قوالیاں اور رونقیں ہوں گی۔ ساری رات اودھم ہوگا۔ پھر آدھی رات کو سبز چائے کا دور چلے گا۔

تایا جان، ابو جان، تائی جان اور امی جان... ان سب کے اودھم اور ہنگامے سے بے خبر صحن میں اطمینان اور سکون سے سوتے ہوں گے... اور... اور... میں اس وقت... اس وقت... بس میں اتنا ہی سوچ پائی تھی کہ سکہ میرے ہاتھ سے پھسل کر گر گیا... میں اندھیرے میں کھڑی خوف اور دہشت سے تھر تھر کانپتی رہی۔ کارنس پر رکھے کلاک کی ٹک ٹک مجھے بتا رہی تھی کہ آٹھ بج گئے ہیں... میں نے گلابی اور کاسنی جوڑے تہہ کر کے اندر رکھ دیئے۔

امی جان کھانا لگانے میں مدد دینے کے لیے مجھے آواز دے رہی تھیں۔ میں خاموشی سے نکل کر باورچی خانے کی طرف گئی اور سالن اور دال کے ڈونگے لے کر دستر خوان پر رکھنے چلی گئی۔ ویسے بھی میرا خیال تھا کہ تم واپس جا چکے ہوگے۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

''تم کو افسوس تو ہوا ہوگا...'' میں نے سوال کیا۔

''افسوس!... ہاں... وہ اس کا موقع ہی کب ملا۔ ایک ماہ تک تو تایا جان کا کنبہ ٹھہرا رہا... فرصت ہی نہ ہوتی تھی اور پھر اگلے ماہ کی چار تاریخ کو میرا نکاح ہوگیا۔ رخصتی نتیجہ نکلنے کے بعد ہونا تھی۔ اس لیے کڑھائی سلائی بنائی کا چکر چل گیا۔''

''نکاح کس سے ہوا؟''

''کسی سے بھی ہوا... اب کیا پوچھنا۔ وہ برا شخص نہیں ہے۔ کبھی پچھتاوا بھی نہ ہوا؟ ملال بھی نہ آیا؟''

''ایک آدھ مرتبہ ہوا تو کچھ ملال سا۔ پر ایک بات کہوں آج میں نے دل ہی

دل میں شکر کیا ہے اچھا ہی ہوا جو ٹاس کرنے کا موقع نہ ملا۔''

''وہ کیوں؟''

''تم کو، تمہاری بیوی کو، تمہاری گاڑی کو دیکھ کر یقیناً تمہارا گھر اور رہن سہن بھی ایسا ہی ہوگا۔ میرا ماحول اور ہے... میں تو سمجھتی تھی کہ تم ہمارے ہی جیسے ہوگے۔ اب میں بالکل نئے ماحول میں تو پھڑ پھڑا کر رہ جاتی۔ہاں جیسے مچھلی پانی سے باہر پھڑ پھڑائے۔''

اس کا گھر آگیا تھا۔ معمولی سا۔پرانی وضع کا تھا۔البتہ جس گلی میں تھا وہ صاف ستھری اور روشن تھی۔

وہ اتری تو میں نے پوچھا،''اگر میں کبھی آؤں تو اعتراض تو نہ ہوگا۔''

''ارے نہیں ضرور آنا۔ میرے میاں بالکل وہمی نہیں ہیں۔تم سے مل کر خوش ہوں گے۔''

وہ مڑی بالکل مچھلی لگ رہی تھی۔

اس کا مزاج بھی تو ویسا ہی تھا۔

منظر بغیر تناظر کے، کچھ لوگوں کے نزدیک یہ ہنسی کی بات بھی ہوسکتی تھی۔ مگر میرے نزدیک تو یہ سب اس ٹنکی کا قصور ہے جو میرے اور منظر کے درمیان حائل ہوئی۔ اور اب اس ٹنکی میں پانی بھی نہیں کہ ٹربائن اچھا خاصا تھا اور زمین کی تہوں میں چھپا آرام سے سوتا تھا۔ اور اس کے پھٹنے کی پیشگی خبر ہمیں کس طرح ملتی کہ زمانوں اور تقدیروں کی خبر دینے والوں نے یہاں آنا اور ستاروں کی چالیں بتانا چھوڑ دی ہیں کہ لوگوں کو اپنی تقدیریں بنانا خود آگئی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بے خبری میں ہماری طرح علاقے کے بیشتر لوگ اپنی ٹنکیوں کے والو (valve) کھولنا بھول گئے۔

میں یہاں سنسان گلی میں پھیلتی دھوپ کو دیکھتی ہوں۔ اور مجھے شدید گرمی کا احساس ہو رہا ہے۔ اِکا دُکا مرد، بیشتر بچے اور بعضی بعضی خواتین بالٹیاں لوٹے اٹھائے گلی میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ میں اکتا کر اندر آگئی ہوں۔ سوچتی ہوں۔

اب لوگ اندر رہیں یا باہر نکل آئیں کوئی فرق نہیں پڑے گا اس لیے کہ وہ پرانے رشتے تو کچے سوت کے دھاگوں کی طرح ٹوٹ چکے ہیں۔

میں چھت کے پنکھوں کو چلتا دیکھتی ہوں، بڑی خود اعتمادی سے، اس لیے کہ کوئی وقت جاتا ہے کہ لوڈ شیڈنگ کا وقت شروع ہو جائے گا۔

ٹربائن کے پھٹ جانے پر سے تین دن گزر چکے ہیں۔ دوسرے ہی دن سے بات اور خبر کے سفر کا آغاز ہوگیا تھا۔ بچے گھڑی گھڑی گلی میں خبریں پھیلا رہے ہیں۔ کھدائی شروع ہوگئی ہے۔

''پائپ لائن بالکل چھلنی اور ٹکڑے ہو رہی ہے۔''

''مرمّت کرنے والوں سے بھری واپڈا کی گاڑیاں آگئی ہیں اور پھر وہ اسی طرح لدی لدائی واپس بھی چلی گئیں۔''

مرمّت کرنے والے گاڑیوں میں اسی طرح لدے بیٹھے رہے۔

نیچے تو اترتے ہی نہیں۔

آپریٹر نمبر تین

دھڑ چھوٹا، ٹانگیں لمبی اور گردن بھی۔ پنڈلی سے لے کر گردن کی اٹھان تک ایک الف سا کھینچا ہوا، اور اس قامت کے سائز سے بہت مختصر چہرے کی ٹکیا چمکتی تھی۔ جس کی سیدھی سپاٹ پیشانی کے نیچے ایک دم دھنسی ہوئی دو آنکھوں کے درمیان ناک کھڑی ہوتے ہوئے، ایک دم طوطے کی چونچ کے موافق نیچے یعنی ٹھوڑی کی جانب جھکتی چلی تو ٹھوڑی نے اوپر کو یوں اٹھنا شروع کیا جیسے وہ ناک کو اوپر کی جانب اٹھانے کی کوشش کرتی ہو۔ عجب کشاکش میں مبتلا تھا اس کا سارا قامت اور سارے کا سارا ڈھانچہ، ایک اچکا سا سویٹر کہ جس کا رنگ کبھی کھٹا (تیز زرد) رہا ہوگا (مگر اب تو عجب ناقابلِ شناخت رنگ تھا) اس کے چھوٹے دھڑ کو بھی پورا چھپانے سے قاصر تھا۔ ابھی پتلون کی کمر شروع بھی نہ ہوتی کہ وہ اوپر کو اچک جاتا۔ ہمیشہ ایک ہی کالے رنگ کی پتلون کہ جس کے پائنچے گٹوں سے اوپر ہی رک گئے تھے، اس کے تن پر نظر آتی (کیا جانے کبھی گھر پر بھی نہ اتارتا ہو اس لباس کو) خیر ڈیوٹی کے اوقات میں تو یہ لباس کھال بن کر برس ہا برس نظر آتا رہا۔ تو یہ تھا حلیہ مائیکروفون کے آپریٹر نمبر ایک کا۔ اس کے متعلق دو آراء کالج میں پائی جاتی تھیں۔ مثلاً کچھ حضرات کا یہ کہنا تھا کہ...

یہ فالتو اور سرپلس شخص ہے، اس کی موجودگی کیا ضروری ہے۔ جب کہ کالج کا اپنا ذاتی مائیک ہے ہی نہیں۔ اب یہاں کرائے پر مائیک منگاتے ہیں۔ ایک آپریٹر بھی آ سکتا ہے۔ دوسرے حلقۂ خیال کا کہنا تھا۔ اس کو مائیکروفون آپریٹ کرنا آتا ہی نہیں۔ یہ تو ٹیسٹنگ کرنا بھی نہیں جانتا۔ اور حقیقت یہ تھی کہ ایسا موقع ہوتا تو وہ مالیوں کے چھوکروں اور کینٹین پر کام کرنے والے لڑکوں کو پکڑ لاتا۔ جو شغلاً گھنٹوں کے حساب سے ہلو ہلو ٹیسٹنگ! ٹیسٹنگ... کا غل مچاتے رہتے۔ تاوقتیکہ پی ٹی والے سر ان کے کان مروڑ مروڑ کر بھگا نہ دیتے۔ اچھا ایک اور حلقۂ فکر بھی اس کے متعلق پایا جاتا تھا وہ یہ کہ... یہ تو ہوسٹل کے کچن میں بطور مشعلچی بھرتی ہوا تھا۔ پھر نہ جانے کیوں پرنسپل صاحب کو اس پر ترس آیا اور اس کو مائیکروفون آپریٹر مشہور کر دیا۔ تنخواہ وہی مشعلچی والی، منصب البتہ اونچا ہوگیا تھا۔ سیاست کا مضمون پڑھانے والے ایک سر کو شک تھا کہ یہ پرنسپل صاحب کے بنگلے پر سودا سلف کے علاوہ باغ میں پانی لگاتا ہے اور بچوں کی سائیکلیں بھی مرمت کر دیتا ہے۔ اسی کشاکش اور افواہ سازی میں وہ مست مگن رہتا اور خاصا گستاخ بھی ہوتا جاتا تھا۔ نوجوان لیکچررز کو شبہ تھا کہ یہ ضرور کسی نشے سے شوق کرتا ہے۔ جب ہی تو آنکھیں مچمچائی رہتی تھیں۔ لال لال بوٹی سی آنکھوں میں سدا چیپڑ بہہ رہا ہوتا تھا۔ پھر ایک ریاضی کے سینئر پروفیسر تھے۔ ان کی ایک یہ بدقسمتی تھی کہ ادھر سگریٹ سلگایا نہیں کہ گھنٹی بجی نہیں، دو چار منٹ جلد جلد کش لے کر ایش ٹرے میں دوبارہ استعمال کی غرض سے چھوڑ دیا کرتے۔ پھر کلاس روم سے واپس آتے تو وہ سگریٹ کا ٹکڑا غائب ہوتا۔ ان کو یقینِ واثق تھا کہ یہ کام سردار کا ہے۔ پھر وہ اس کو سڑی سڑی گالیاں دیتے (اس کی پیٹھ پیچھے) حرام خور، چور، سالا کسی کام کا نہیں۔ مائیک کی دکان سے سب سے ردّی، نکما آلہ لے کر آئے گا۔ جو دس پندرہ منٹ چل کر ایسی آوازیں نکالے گا جیسے کسی کو اُچھو لگ گیا ہے۔ پھر ہچکیاں لے لے کر آپ ہی خاموش ہو جائے گا۔ اصل بات یہ تھی کہ جب ایسی صورتِ حال ہوتی اور فنکشن کے انچارج پروفیسر یا لیکچرر صاحبان سردارے سے درخواست کرنے اس کونے میں پہنچتے جہاں وہ اپنے آلات اور تام جھام

سمیت پردے کے پیچھے چھپا بیٹھا ہوتا تو منظر کی دید سے خون اتنا کھولتا کہ کہتے ہیں کہ کئیوں کو بلڈ پریشر کا عارضہ ہی سردارے کے باعث ہوا۔کیا دیکھیے کہ سردار ٹوٹی ہوئی آرام کرسی میں دھنسا آرام سے خرخر سویا پڑا ہے۔

ایک اور حرکت بھی وہ کرتا تھا اور یہ حقیقت تھی افواہ نہ تھی۔فنکشن کی تقریریں لمبی ہونے لگتیں تو وہ چپکے سے تار ہی نکال دیا کرتا اور پڑ کر سو جاتا۔لوگ ہلا کرتے تو کہہ دیتا، پرزہ ہی ٹوٹ گیا آواز پکڑنے والا۔

واقعی بہت ہی بور ہو جاتا ہوگا تقریریں سن سن کر۔ بوٹنی کے پروفیسر ہمیشہ اس کی حمایت میں بولا کرتے تھے۔

سردار اپنی ملازمت کے بارے میں دو قسم کے متضاد بیان دیتا تھا، ایک یہ کہ مجھے دم مارنے کی فرصت نہیں۔

''بھئی کیا فرصت نہیں۔''

''لو بھئی لگا لو حساب تم...'' ریاضی کے جونیئر لیکچرر کو تو وہ منھ توڑ جواب دیتا۔ کون سا مہینہ جاتا ہے جس میں دو تین فنکشن نہیں ہوتے (فنکشن کو وہ سدا فکشن ہی کہتا) ایمان سے ایک فکشن سن سن کر اتنا تھکتا ہوں کہ تین دن تو لگتا ہے سر ہی غائب ہوگیا۔

''ارے تو ایسی باتیں ہوتی ہیں ہماری؟'' ایک صاحب نے سوال کیا، ''مجھے کیا پتا، قسم لے لو جو ایک لفظ بھی سنتا سمجھتا ہوں۔''

اگر کوئی اس سے سگریٹ، پان یا کینٹین سے چائے لانے کو کہہ دیتا تو وہ صاف جواب دیتا۔

''صاحب جی، کسی فل ٹائم کو دسو، میں پار ٹائمر ہوں۔ میں تو فکشنوں کی ڈوٹیاں کرنے پر ہوں۔''

''ابے! تو دن بھر کالج میں کیوں گھومتا ہے پھر؟''

جی پرنسپل صاحب کا حکم ہے تم چوبیس گھنٹے کے ملازم ہو۔ایتھے ہی روا کرو...

وہ کسی کونے میں بیٹھ کر اپنے ٹوٹے جوتے خود ہی گانٹھنے لگتا۔

بس لوگوں کا کہنا تھا یہ جوتے وہ پہنے پہنے پیدا ہوا ہے۔ پہنے پہنے ہی اس دنیا سے رخصت ہوگا۔

تو جناب یہ تھا سردار۔ فنکشنوں میں جتنی جھڑکیاں اور ڈانٹیں اس کو ملتیں شاید ہی کسی کو ملتی ہوں۔ یہ دوسری بات تھی کہ نہ کبھی برا مانتا نہ آواز اونچی کرتا۔

اسکول، کالج سرکار کی تحویل میں آئے تو کالج کا جو آدمی پہلے ہی ہلے میں منظر سے غائب ہوا وہ سردار تھا۔ کہتے ہیں جس دن وہ رخصت ہوا دیر تک مائیکروفون کا منہ پکڑے چپ چاپ کھڑا رہا تھا۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ کالج کے ملازمین نے پچھواڑ والے نیم تلے سردار کو کوئی پالٹی بھی دی تھی... اور بھینچ بھینچ کر ایک دوسرے سے گلے ملے تھے۔

سردارا اپنے پیدائشی جوتوں، کھٹے رنگ کے سویٹر اور کالی پتلون سمیت غائب ہوا تو کالج کے ملازمین کو پہلی دفعہ دنیا کی بے ثباتی کا شدید احساس ہوا۔

''رہے نام اللہ کا۔''

اب قاعدے سے آپریٹر نمبر ۲ (جو نہ معلوم کس ارادے سے بھرتی ہو کر آئے تھے کا دور دورہ آیا...) اوّل تو پروفیسر حضرات کو اسی بات پر حیرت تھی کہ ان کو سردارے سے نجات پا کر خوشی کیوں نہ ہوئی۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اب جو نیا آپریٹر آیا ہے اس کی آمد پر ناک بھوں کیوں چڑھا رہے ہیں کہ اس نیک قدم کی آمد پر ایک عدد نیا اور عمدہ قسم کا مائیک اور اس کا تام جھام بھی خود کالج نے خرید لیا تھا۔

مگر یہ آپریٹر تھا... کہ کوئی تھانیدار۔ چرمر کرتا، بڑی بڑی مونچھیں۔ یہ موٹی موٹی، یک منٹ میں لال ہو جانے والی آنکھیں منیرز (Manners) کا یہ عالم کہ بھکا بھک پرنسپل صاحب تک کے منہ پر سگریٹ پینا، پروفیسروں کو شک تھا کہ اگر اس کے کام میں ذرا دخل دیا تو یہ گریبان پر ہاتھ ڈال دے گا۔ ایک بار پھر مائیکروفون کا آپریٹر زیرِ بحث اور موضوعِ گفتگو رہنے لگا۔ ہر قسم کے کنوینر صاحبان اپنے فنکشنوں کی ساری

خرابی مائیک والے کے سر تھوپنے لگے اور یوں خود بری الذمہ ہو جاتے۔ اونچی اونچی آوازوں میں مطالبہ کرنے لگتے۔ منظور احمد کی تبدیلی کروا دیں، یہ جان جان کر ہمارے فنکشن خراب کرتا ہے، ہر وقت چابیاں مروڑتا رہتا ہے۔

منع کرنے پر طیش میں آجاتا ہے، ہاتھا پائی کی نوبت آتی ہے۔ پرنسپل غریب ایک ایک کا منھ دیکھتا، گھبراتا مگر یہ نہ پوچھ پاتا کہ سینئر لڑکے تقریریں کیوں بھول گئے تھے اسٹیج پر آکر۔ جی وہ مائیکروفون نے گڑ بڑا دیا۔

''اچھا چائے کیوں پتلی پانی تھی اور پھر ٹھنڈی، اوپر سے پیسٹری باسی۔ اس افراتفری کا سبب بیان کریں۔'' جی وہ مائیکروفون!

اب یہ حد ہوگئی۔ میٹنگ برخاست ہو جاتی۔ اچھا...اچھا جایئے اپنا اپنا کام کیجیے۔ آئندہ شکایت نہ ہونے پائے، اور جب پرنسپل صاحب کا خاص چپڑاسی آکر منظور احمد کو اطلاع دیتا۔

''ابے تیری بدلی ہونے والی ہے، سارے مل گئے ہیں، کہتے ہیں یہ ہمارے فنکشن بگاڑتا اور برباد کرتا ہے۔''

''کون پیدا ہوا ہے میری بدلی کرنے والا۔ اور فنکشن تو یونہی برباد ہونے ہیں۔ جو میں معاملے کی بات کرتا ہوں۔'' اس نے ہتھیلی کھجلائی، ''یہ گرم ہوجائے تو ایسا فنکشن بنادوں کہ تمام عمر یاد رہے...مگر اب خالی خولی تو کام نہیں چلتا... یہ بھی کوئی خیرات خانے کا حساب کتاب ہے۔ یہ لاؤ... یہ... وہ چٹکی مسل کر اشارہ کرتا۔

استاد اس سے تھر تھر کانپنے لگے تو اس کے خلاف افواہوں اور شکوک کے سارے دریچے کھل گئے۔ یہ تو کسی پاور فل آدمی کا غنڈہ جان پڑتا ہے۔ کچھ ڈرتے تھے اور کچھ مشکوک رہتے تھے۔ اور منظور احمد تھا کہ ہانکے پکارے کہتا تھا کون ہے جو میری بدلی کروائے گا اور میں یہاں ٹھہروں گا۔ یہی نہیں... دیکھ لینا سارے فنکشن ملیا میٹ کروں گا۔ اسی ایک مائیکروفون کی کنجی گھما کر... اور پھر میں تو چلا ہی جاؤں گا... میرا بھائی مجھے ویزا بھیج رہا ہے دوبئی سے...

فنکشنوں کا زمانہ آتا تو سارے انچارج صاحبان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگتیں۔

پھر ایک دن ایسا چڑھا کہ ایک فنکشن سے عین ایک گھنٹہ پہلے پتا چلا کہ منظور احمد صاحب دوبئی سدھار گئے ہیں کہ ویزا آ گیا تھا... یقین نہ آتا تھا کہ اتنی جلدی اور اتنی بے التفاتی کہ تقریب سے ایک گھنٹہ پہلے۔ خیر اب کیا تھا۔ تب اس وقت معاشیات کے ایک صاحب نے اپنی خدمات پیش کیں۔ گھبرانے کی کوئی بات ہی نہیں...میں کر سکتا ہوں...یہ کام...دیکھو کوشش کرتا ہوں۔

یہ پہلی تقریب تھی جو ساری کاروائی ڈھنگ قرینے سے ہوئی۔کئی دن تک منظور احمد کے غائب ہونے کے چرچے کے ساتھ ساتھ اسٹاف روم میں جو مسئلہ زیرِ غور رہا وہ یہ تھا کہ آخر یہ مائیک پر بیٹھنے والے،کس پتھر کے بنے ہوتے ہیں۔ صبح سے شام تک علمی، ادبی، سائنسی اور سیاسی تقریریں سننے کے باوجود ان میں جونک نہیں رینگتی... یہ ویسے کے ویسے ہی رہتے ہیں۔ اور پھر اس کالج کی تاریخ میں تیسرے آپریٹر کا تقرر ہوا۔ بھلا پروفیسر صاحبان آپریٹروں کی شخصیتوں اور بے اثر طبیعتوں سے اتنا بددل ہو چکے تھے کہ نئی تقرری کو انھوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا لیکن تابہ کے...باہر سے ایک ماہرِ ارضیات آئے ہوئے تھے، اُن کا لیکچر ہونے والا تھا۔ جغرافیہ کے ایک سینئر پروفیسر جو گزشتہ مائیک آپریٹروں سے اتنے بد دل ہو چکے تھے کہ موجود آپریٹر سے بات کرنے پر ہرگز تیار نہ تھے، انھوں نے ایک جونیئر کی ڈیوٹی لگائی کہ اس کو ٹٹولیں، دیکھیں اور کوشش کریں کہ بری بھلی جیسی بھی کارروائی ہو سکے، وہ کروائیں۔

وہ حضرات اس سے بات کر کے آئے تو بڑے متاثر تھے۔ اور ان کا کہنا تھا کہ بارہ برس بعد گھورے کے دن پھرتے ہیں۔ سو اب اس کالج کی کارروائیوں کے دن بھی پھر گئے کہ نہایت شستہ و رفتہ نوجوان مامور ہوا ہے۔

نوجوان نکلتے ہوئے قد کا اسمارٹ لڑکا تھا۔ شکل صورت سے کالج ہی کا طالبِ علم معلوم ہوتا تھا۔ بات کرنے پر معلوم ہوا کہ کل چھ جماعتیں پڑھی تھیں کہ باپ

کی بیماری کی وجہ سے پڑھائی چھوڑ کر بجلی کے میکینک کا کام سیکھنا پڑا اور اب تقریباً کام سیکھ کر یہاں آیا ہے۔

وہ ہر بات نہایت غور سے سنتا اور احکامات کی بجا آوری کرتا تھا۔ کارروائیوں کے دوران اس کی محویت کا یہ عالم ہوتا کہ اگر کوئی مائیک کام نہ کرتا تو نہ تو کوئی اشارہ اس کو مخاطب کر سکتا... نہ کوئی آواز اس کے کان میں پڑتی۔ تقریب کے منتظمین خود جا کر کاندھا ہلاتے تو چونک جاتا۔

''تم کیا سو رہے تھے؟''

''نہیں تو جناب۔ تقریر بہت خوب صورت ہے۔''

''تقریر بہت خوب صورت تو نہیں ہوتی بہت خوب ہوتی ہے مگر یہ خوب صورت تقریر سامعین تک پہنچنا چاہئے۔''

''ارے صاحب ان تک پہنچے نہ پہنچے ایک ہی بات ہے، اس نے کون سا ان کے اندر اترنا ہے، اوپر اوپر ہی گزر جائے گی۔'' اگلی ہی صف میں بیٹھے استادوں کی طرف اشارہ کرتا۔

دل تو خیر جل کر کباب ہوتا ہی مگر تقریب کو کامیاب بنانے کی خاطر بات ٹالنا پڑتی۔

''اچھا اچھا پر مائیک تو ٹھیک کرو۔'' اس کا جی چاہتا تو ٹھیک کر دیتا ورنہ آواز کے پرخچے اڑا کر رکھ دیتا۔

''سنیں نہ سنیں... ان پر کون سا اثر ہونا ہے۔''

''اثر تو تم پر ہی ہونا ہے، بادلِ نخواستہ''... زیرِ لب تاریخ کے نوجوان لیکچرر کے منہ سے بات نکل ہی پڑتی۔

''جی اثر تو ان پر ہونا چاہئے، یہ جو آپ کی نئی نسل بیٹھی ہے نژادِ نو... اور میرا کیا ہے میں ایک بے مطلب و معنی لفظ ہوں۔'' تاریخ کا استاد اس کی شکل دیکھنے لگا۔

اس تاریخ سے اب اسٹاف روم میں پھر تیسرے آپریٹر کو بطور اسکینڈل مذکور

کیا جانے لگا۔

''پُر پرزے نکال رہا ہے۔'' کوئی کہتا۔

کسی اور کا کہنا تھا، ''یہ پوسٹ ہی بری ہے۔ اس پر اب تک کوئی ایسا نہ آیا جو خود بھی مطمئن رہا ہو اور ہمیں بھی رکھا ہو۔''

''خیر سردارا تو بے حد مطمئن رہا، اپنی پوسٹ سے بھی اور اپنی کارکردگی سے بھی۔''

''اور کارکردگی کیا رہی ہے۔ ذرا یہ بھی یاد کرلو۔''

کسی کو پتا بھی نہ چلا۔ایک مرتبہ سنا وہ چھٹی پر گیا ہے۔ لمبی چھٹی لے کر تین ماہ بعد واپس آیا تو خود اعتمادی پہلے سے کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی۔ خدا خیر کرے کئی حضرات کے منھ سے ایک ہی فقرہ نکلا تھا۔

پتا یہ چلا کہ حضرت میٹرک کا امتحان دے آئے ہیں اور پرچے فرسٹ کلاس ہوگئے ہیں۔

اس کے بعد سے اس کی طویل فلسفیانہ، منطقی اور سیاسی بحثوں کی وجہ سے کوئی بھی اس سے بات کرنے کا متحمل نہ تھا۔

اصل وجہ کچھ اور تھی کہ ہم لوگ یہ برداشت نہ کرسکتے تھے کہ وہ جو ایک معمولی آپریٹر (جس پر سردارے جیسی موٹی عقل کی چھاپ لگی تھی) دانش و فراست میں اب ہماری برابری پر اتر آئے۔

ہم لاکھ دانشور اور اہلِ فراست ہوں مگر اب یہ بھی تو اچھا نہیں لگے گا کہ ادنیٰ سا ٹیکنیشن وہ بھی ایک ایسی پوسٹ پر کہ جس پر سردارے جیسی شخصیت فائز تھی، اب اٹھ کر ہماری گفتگو میں برابری سے دخیل ہو... ہم اب یہ بھی تو نہ چاہیں گے کہ ہر ایکس وائی زیڈ اٹھے اور ہم سے دوبدو کرے (معقولیت کے ساتھ) (ہاں بات اگر نامعقولیت پر مبنی ہو تو ان پر کھپ بھی جاتی ہے اور ہم اس سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں) عوام میں اتنی عقل و دانش اچھی نہیں لگتی۔صاف لفظوں میں یہ بات ہم کہہ بھی تو نہ سکتے تھے۔

بس کچھ خلش سی محسوس ہوتی تھی، کچھ رشک سا (اس کے دلائل ہماری باتوں سے زیادہ ٹھوس اور تعقل پر مبنی ہوتے تھے)

پھر ایک وقت آیا کہ وہ غائب ہوگیا، ہم تو یہی سمجھتے رہے کہ وہ پھر لمبی چھٹی پر چلا گیا لیکن تقریبات کا موسم آیا تو پتا چلا کہ وہ استعفیٰ دے گیا اور یہ کہ اس نے بی اے بھی فرسٹ کلاس میں پاس کر لیا ہے اور شاید وکالت پڑھ رہا ہے۔

تجربے سے معلوم ہوا کہ کرائے پر بلایا ہوا آدمی اُن مستقل آپریٹروں سے زیادہ بہتر اور مناسب رہتا ہے۔ چنانچہ اس نمبر تین آپریٹر کے بعد پھر کبھی کوئی نمبر چار اس پوسٹ پر نہ آیا۔ اس بات کو بھی کئی سال گزر چکے ہیں۔

مگر آج جو تعجب اور اچنبھا ملا ہے اس کی تو زندگی میں توقع نہ تھی۔ کالج کے پورے اسٹاف کے نام نہایت دیدہ زیب لفافے ڈاک سے وصول ہوئے۔ ہمارا خیال تھا کوئی دعوت نامہ ہوگا لیکن لفافے کھلنے کے بعد اور مراسلے نکلنے کے ساتھ پورے اسٹاف پر وہ سکوت طاری ہوا لگتا تھا کہ اسٹاف روم نہ ہو بت کدہ ہو، سارے لات و منات سرنگوں بیٹھے ہوں۔

اس مراسلے میں اپنے کوائف اور ووٹ کی درخواست کے آخر میں لکھا تھا۔

آپ کا خادم
آپریٹر نمبر تین

میرا انتخابی نشان مائیکروفون یاد رکھئے۔

آپ خود ہی اندازہ لگا لیجیے کہ ہم تو یہ کہنے جوگے ہی نہ رہ گئے تھے کہ:

محو حیرت ہوں دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اور اب کہنے کو رہ بھی کیا گیا ہے۔

نمانا جیسا آدمی

پتا نہیں بعض لوگ ''نمانے جیسے'' کیوں ہو جاتے ہیں، اور کیسے ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی میں بڑی حیران ہو جاتی ہوں کہ یہ کیا اللہ تعالیٰ انھیں بناتا ہی ایسا ہے یا پھر وہ خود بخود ہی ایسے ہو جاتے ہیں۔

''چلو ہو ہی جاتے ہوں گے... پوز کرنے لگتے ہوں اور...اور پھر پوز کرتے کرتے ایسے ہی دکھائی دینے لگتے ہوں گے عجیب قسم کے، نہ اچھے نہ برے!... بس ہوتے ہیں۔

ایسے ہی ایک شخص سے میرا واسطہ پڑا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ کبھی کبھی میں اور میری رفیقِ کار خضریٰ (ہم دونوں ایک ہی میز پر بیٹھتے ہیں) اس موضوع پر بات کرنے لگتے...اور ہمیں یا صرف مجھ کو ہی احساس نہ ہوتا کہ بالکل ساتھ والی تیسری کرسی پر میرے بالکل برابر وہ نمانا جیسا آ کر بیٹھ گیا ہوتا نہ جانے کب کا۔

اپنی لمبی لمبی ٹانگیں میز کے نیچے کیے، گھٹنوں میں جھول ڈالے، گردن نیہوڑائے... ایسے بیٹھا ہوتا جیسے اس کی طبیعت اچھی نہ ہو۔ یا پھر کسی غوطے میں چلا گیا

اب خبروں کی ترسیل میں بڑوں کی شرکت بھی ہوگئی ہے۔

اندازے اور قیاسات۔

لمبا ہی کام ہے۔

ابھی تو آدھی کھدائی نہیں ہوئی۔

خود بخود لوگوں کے درمیان بات کا رشتہ قائم ہو رہا ہے۔

ایک عجیب بے نام تعلق بغیر کسی منصوبہ بندی اور تحریک کے۔

آج کی رات لوڈشیڈنگ کی رات تھی۔

کہ اس علاقے میں جو پہلے سب کا تھا اور سب مل کر اس کو ہمارا کہتے تھے، اب فرد فرد کا علاقہ ہوگیا ہے۔

اور فرد اپنی چیز کو میری چیز، میرا علاقہ، میرا بنگلہ اور میری گاڑی کہہ کر واحد ملکیت کا احساس دلاتا ہے۔

آج کی رات میں نے گرجا کی دو دیواروں کے مل جانے سے بن جانے والے گوشے میں نصب بجلی کے کھمبے تلے کھڑے انسانوں کو دیکھا ہے جو آپس میں ہم کلام تھے اور میرے نزدیک یہ آج کی ایک اہم خبر تھی۔

اور میں سوچ رہی تھی کہ کیا لوڈشیڈنگ اچھی چیز ہے کہ اس کھمبے میں اس وقت بجلی موجود نہیں پھر بھی اس کے تلے اہلِ محلّہ کھڑے آپس میں کلام کرتے ہیں۔

اور... اور... ٹربائن کا پھٹ جانا کیا اس سے بھی اچھی بات ہے؟

یقین کیجیے۔ یہ میں نے سوال نہیں کیا ہے۔ بلکہ ایک بات کہی ہے۔

اور میں اپنے اس عالم میں اپنے آپ کو بات کہنے کے قابل محسوس کر رہی ہوں اور میری آنکھیں ایک میورل سا بنتا دیکھ رہی ہیں۔ منظر کا ایک تناظر قائم ہو رہا ہے۔ لوگ گھڑی گھڑی ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں۔

سوال کر رہے ہیں۔

جواب دے رہے ہیں۔

ہو۔ پہلے پہل تو میں یہی سمجھتی رہی کہ کوئی مرض یا تکلیف ہے جو اس کو گھن کے مانند اندر ہی اندر پیسے ڈالتی ہے...کھائے جا رہی ہے....

کسی کی صورت دیکھ کی اس کے اندر کے صدمے اور امراض ڈائیگنوز (Diagnose) کرنے کا مجھے خبط ہے۔شروع میں تو میں نے اس کے لیے ضعف معدہ کی بیماری تجویز کی... اور اس کے لیے میں اس کو مختلف دیسی علاج اور پرہیز کی ہدایتیں اور نسخے لکھواتی رہی جنھیں وہ بڑی سعادت مندی سے نوٹ کرتا۔نہ کوئی سوال کرتا نہ کسی بات کی تردید کرتا (کہتے ہیں ایسے مریض معالج کے لیے رحمت اور نعمت ہوتے ہیں) خیر بات کرنے کی تو اسے یوں بھی عادت نہ تھی بس ہوں، ہاں میں ہی گفتگو تمام ہو جاتی۔

پھر کچھ دن بعد مجھے خود ہی شک ہونے لگا کہ میری تشخیص سراسر غلط تھی۔ اور اتنے دن میں اس کو بالکل غلط اور الٹ دوائیں استعمال کرواتی اور غلط قسم کی غذاؤں اور پرہیز پر عمل کرواتی رہی ہوں...تو چنانچہ میں شرمندہ ہونے اور پچھتانے لگی...تو ایک دن خضریٰ نے کہا۔

''بے سود پچھتاووں میں نہ پڑو... میری مانو۔ اس نے تمہاری ایک بھی ہدایت پر عمل نہیں کیا ہے۔''

مجھے اس کی یہ بات بری لگی... وہ جیسا بھی ہو مگر ایسا بھی نہ ہوگا۔ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

''تم کیسے کہہ سکتی ہو؟ یوں ہی بکواس کرنے نہ بیٹھ جایا کرو۔'' میں مستقل ندامت میں مبتلا تھی۔

''ایسے کہ اگر تمہاری ہدایتوں اور تجویزوں پر اس نے ذرا بھی عمل کیا ہوتا تو نفع یا نقصان کی صورت میں اس پر کوئی تو فرق نظر آتا... یوں جوں کا توں تو نہ نظر آتا۔''

خضریٰ نے فاتحانہ میری طرف دیکھا...میں اب پچھتاووں کے بوجھ کے علاوہ شکستگی سے اور بھی مضمحل نظر آ رہی تھی شاید۔

جب ہی تو وہ پھر چپکی۔

اچھا شرط لگاتی ہو؟ (خضریٰ کو شرطیں لگانے اور کمیٹیاں ڈالنے کا بڑا خبط تھا۔ خیر کمیٹیاں تو ابتدائی مراحل میں ہی فلاپ ہو جاتی ہیں مگر شرط وہ ہمیشہ جیت جاتی تھی) میں شرط لگانے کے خیال سے لرز گئی۔

نہیں... شرط کیا لگانا۔ دراصل اب اندازہ ہوا... کہ اس کا یرقان بگڑ گیا ہے... ایک دم ہی احساس ہوا برابر والی کرسی پر گردن ڈالے وہ بیٹھا ہے۔ نہ جانے کس وقت آ بیٹھا ہوگا۔

میں مڑ کر اس سے مخاطب ہوگئی۔

یرقان بگڑ جانے کی صورت میں استعمال ہونے والی دواؤں۔ ترکیبِ استعمال، پرہیز... اور غذاؤں کی تفصیل اسے سمجھانے لگی اور وہ نمانا جیسا ایک ہی جیسے رنگوں والے سوتی ڈوریئے کی قمیص اور خاکی زین کی پتلون میں گھسا ہوا میز کے نیچے گھسی ہوئی لمبی لمبی ٹانگوں کے گھٹنوں میں جھول ڈالے (ایمان سے اسے دیکھ کر سارس یا لم ڈھینگ کا خیال آنے لگتا) اونگھتا سا بیٹھے بیٹھے چونکا اور میرے ہی آگے سے ایک کاغذ کھینچ کر ہدایتیں نوٹ کرنے لگا۔

اور میں بڑے غور سے اس کی طرف دیکھتے دیکھتے اس ایقان سے دوچار ہوگئی کہ اس کی صحت کی خرابی کا بڑا سبب اس کا یہ آؤٹ ڈیٹڈ اور بھوسلا بھوسلا لباس ہے۔

خیر یہ لباس کے بارے میں تجویز وہدایت کو کسی اور موقعے پر اٹھا رکھا۔

اس دن جب وہ اٹھ کر گیا تو خضریٰ پھٹ سے بولی۔

''بھئی یہ بیمار ویمار ہرگز نہیں ہے... یہ... یہ تو مجھے کچھ پراسرار سا آدمی نظر آتا ہے۔''

''مثلاً کس قسم... کس نوعیت کا...؟''

''جن! بھوت!... سایہ آسیب یا اس کے علاوہ۔ کچھ اور بھی۔'' ہماری میز پر چائے آچکی تھی۔ موضوعِ بحث تبدیل ہوگیا۔ اب خضریٰ منظور سے بسکٹوں کے موضوع پر

تبادلۂ خیال بلکہ مباحثہ اور مجادلہ کر رہی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ کھوپرے کے مزے والے بسکٹوں سے اب میں بھی چڑ گئی تھی۔

کچھ ایسا ہوا کہ اس کی صحت کی طرف سے فکر سی رہنے لگی تھی۔ ہر وقت یہی ندامت سی رہتی کہ زیادہ خرابیاں تو میری الٹی سیدھی تجویزوں اور تشخیصوں کی ڈالی ہوئی تھیں... اگرچہ خضریٰ کا مشاہدہ کہتا تھا کہ وہ اول دن سے جوں کا توں ہے... پھر بھی دفتر ختم کر کے گھر جاتی تو بھی اپنے معمولات کے درمیان اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے کسی نہ کسی موڑ پر خیال آتا ہی رہتا... ایک دھڑکا سا رہنے لگا۔ خصوصاً ان دونوں میں جب وہ اپنے معمول میں وقفہ ڈال دیتا۔ کئی کئی دن کو غائب ہو جاتا۔ لگتا تھا کہ کوئی دن جاتا ہے کہ سننے میں آئے گا کہ وہ بالکل ہی پلنگ سے لگ گیا ہے۔ ہسپتال کے جنرل وارڈ میں پڑا ہے۔ پھر ایک صبح جو نظر پڑتی تو وہ برابر والی کرسی پر اسی نمانی جیسی حالت میں بیٹھا ہوتا۔

اب صاحب سلامت تو بندے کا فرض ہے سو وہ تو ہونا ہی تھی۔ میں اپنے کام میں جٹ جاتی۔

دراصل وہ ہمارے آفس کا آدمی تو نہ تھا۔ اب یہ بھی سوچتی ہوں کہ آخر وہ کام کیا کرتا تھا... اور کرتا بھی کس وقت دن کا اچھا خاصا وقت تو ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر گزار دیتا۔ پھر بیٹھا بیٹھا اٹھ کر چل دیتا۔ گھٹنوں میں جھول ڈالے۔ لم ڈھینگ کے انداز میں گردن اٹھائے۔ کندھے ڈالے کیوں آتا ہے... کہاں جاتا ہے؟ یہ سوچنے کے لیے ہمارے پاس وقت ہی کہاں ہوتا۔

بات یہ ہے کہ ہمارا کام ہی اس نوعیت کا تھا کہ سر پیر کا ہوش ہی نہ رہتا۔ بس لمبی لمبی رپورٹوں کو تیار کرنا اور فائل کرنا... رپورٹیں بھی کچھ اس نوعیت کی کہ زیادہ تر یہ بھی پتا نہ چلا پاتے کہ ان کا متن کیا ہے۔ زیادہ تر تو کوڑ ہی کوڑ بھرے ہوتے۔

ایک ہمارے بوس کی یہ عادت کہ ہر بات کانفیڈنشل۔ کاغذ اور ہر سطر کے بارے میں تاکید کہ یہ ٹاپ سیکرٹ ہے۔

''لو بھئی یہ تو ہمیں ٹوپ سیکرٹوں تلے ہی دبائے رکھیں گے۔ ساری عمر۔''

خضریٰ بڑبڑایا کرتی۔ ''ذرا ذرا بات پر سرکلر آنکھوں کے آگے نچانے اور اس پر ہمارے دستخط لینے میں لگے رہتے ہیں۔'' ہمارے سارے ہی رفقائے کار بڑبڑ کرتے۔

مگر ہمیں بھی ہر بات اور ہر کاغذ کو صیغۂ راز میں رکھنے کی عادت پڑتی جارہی تھی۔ زندگی... ایمرجنسی ارجنٹ۔موسٹ ارجنٹ...خفیہ... راز داری جیسے الفاظ کے پہیے کے گرد تیزی سے گھومتی رہتی۔اب ہم بات بھی زیادہ وقت کوڈ ہی میں کرنے لگے تھے یعنی ذاتی نجی گفتگو، ہنسی مذاق سب کے کوڈ بنا لیے تھے۔

ایسے ماحول میں ایک بیگانہ، غیر متعلق اور نمانے جیسے آدمی کا آکر اطمینان سے برابر والی کرسی پر بیٹھ جانا قابلِ اعتراض اور قابلِ غور بات تھی۔ مگر کسی کو مہلت ہی نہ تھی، یہ سوچنے کی کہ اتنی بڑی بات پر ہمارے بوس کو... خیر۔

ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔ جب میں رپورٹ مکمل کر کے فائل کر رہی تھی تو آخری بار کاغذات کی گنتی پر پتا چلا کہ کاغذ بیچ میں موجود نہیں ہے۔ نمبر چار کاغذ گم تھا۔ ہمارے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔کاغذوں میں دیکھا۔ درازیں کھول کھول کر تلاش کیا۔ گیا تو کہاں... وہ اٹھ کر جا چکا تھا۔نہیں تو خضریٰ اس کی بھی جامہ تلاشی لینے کے موڈ میں تھی۔ مارے وحشت کے ہمارے حلق میں کانٹے پڑنے لگے، ہونٹ خشک ہوگئے۔ خضریٰ نے مجھے اشارہ کیا آگے بات نہ نکلے ہم دو کے علاوہ چڑیا کوّے کے کان میں بھی پڑے۔

میں نے سوکھے گلے سے مری ہوئی آواز میں امید ظاہر کی۔ ہوسکتا ہے پچھلی دفعوں کی طرح ہمارے ہی کاغذوں میں مل جائے (ایسا دو تین بار پہلے بھی ہوا تھا۔)

''ہاں! ہاں ہم اس وقت نروس ہیں۔'' خضریٰ نے تائید کی، ''گھبراہٹ میں سامنے پڑی چیز نظر نہیں آتی۔''

پچھلی دفعوں کی طرح اس مرتبہ بھی ہم نے فائل آگے چلانے کے بجائے اپنے لاکر میں مقفل کر دی۔ دفتر کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ اس ڈر سے کہ مبادا ہم کسی

کے سامنے کچھ کہہ گزریں۔جلد از جلد اپنی تھرماسیں اور لنچ بوکسز سنبھال کر تھیلے میں ڈالے، کالی عینکیں آنکھوں پر چڑھائیں (اس خیال سے بوکھلاہٹ میں بڑا افاقہ ہوا کہ کالے شیشوں کے عقب میں موجیں مارتی پریشانی پر اب کسی کی نظر نہ پڑے گی) سختی سے ہونٹ بھینچے ہم باہر نکل آئے۔

اگلے دن عجیب واقعہ ہوا۔ابھی ہم یہ سوچ کر کہ چپکے سے دوسرا کاغذ بنا کر لگائے دیتے ہیں۔فائل کے کاغذ پھیلا کر بیٹھے ہی تھے کہ خضریٰ کی فون کال آ گئی اور مجھے ٹائپسٹ نے متوجہ کیا کہ وہ ایک لفظ کے ہجوں کے بارے میں مشکوک تھا، تصحیح چاہتا تھا۔ میں بس اٹھ کر گئی اور واپس آئی۔ ابھی کاغذات کھول ہی رہی تھی کہ کیا دیکھتی ہوں... کیا دیکھتی ہوں کہ نمبر چار کاغذ اپنی جگہ پر موجود سامنے چمک رہا تھا۔ آنکھیں مل مل کر دیکھا... پھر دیکھا... اور پھر دیکھا مگر واقعی موجود تھا۔

ابھی میں اکسائٹ منٹ میں خضریٰ کو چلا کر پکانے ہی والی تھی کہ درمیانی سطور پر نظر پڑی جن کو سرخ پنسل سے انڈر لائن کیا گیا تھا۔ تیر کے اشارے کے ساتھ حاشیے پر نوٹ لکھا تھا۔ باس کا مخصوص کڑا لہجہ...''عبارت بہت فاش کر دی ہے... کوڈ... کوڈ... پھر آئندہ محتاط رہنے کی کڑے لفظوں میں ہدایت بصورتِ دیگر سخت اقدام لینے کی دھمکی۔''

میں تو سناٹے میں آ گئی...آ تو خضریٰ بھی سناٹے میں گئی تھی، پر اس کے اعصاب میرے مقابلے میں مضبوط اور استوار تھے...دوبارہ کاغذ لکھا گیا۔ ٹائپ کروایا گیا۔ فائل آگے چل پڑی... پھر بھی دل تمام وقت اچاٹ رہا۔پھر شام آئی ہم نے اپنا دفتر سمیٹا، درازوں اور لاکروں کو مقفل کیا۔ اپنی چیزوں کو سمیٹ کر تھیلے میں ڈالا۔ آنکھوں میں سیاہ چشمے چڑھا کر کالے شیشوں کے عقب میں موجیں مارتے حیرت و استعجاب پر پردے ڈالے جو صبح سے منہ زوری پر آیا ہوا تھا۔

راستے میں چلتے چلتے خضریٰ نے عجیب سی آواز میں ایک سوال سرِراہ اچھال دیا۔

Informers میرا مطلب ہے مخبروں... اور... اور پیچھا کرنے والوں اور دوسروں پر کڑی نظریں رکھنے والوں کے متعلق کیا خیال ہے۔

اس کی بتیسی سختی سے جڑی ہوئی اور لب ایک دوسرے سے پیوست تھے۔ لیکن میں اس کا سوال سن سکی تھی اور مجھے پتا تھا کہ اس سوال کا جواب مجھے ہی دینا ہے۔ سو میں نے بھی ویسی ہی گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

کیا مطلب؟ اب اس کا لب۔ لب سے جدا تھا۔ بتیسی پوری طرح کھل چکی تھی اور جھنجھلاہٹ اس کی آواز میں نمایاں تھی... جب تم کسی سوال کا جواب گول کرنا چاہتی ہو تو.... انگریزی بولنا شروع کر دیتی ہو۔

''لیکن انگریزی تو تم بھی بخوبی جانتی ہو، بولنا اور سمجھنا بھی، ویسے تم کہنا کیا چاہتی ہو۔''

میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ جب کوئی فضول ہی ہمارا ہم راز بن جائے اور پیچھا کرنے لگے۔ اور چپ رہے، تو وہ ہم پر مسلط کیا گیا ہوتا ہے۔

میں سمجھ رہی ہوں کیا کہنا چاہ رہی ہو... مگر میری جان ہم تو سرکاری...

ہاں مگر ہم پر ان سب پر بھی کسی نگران مقرر کیا جا سکتا ہے اور اس نگران پر بھی کوئی... خضریٰ زبردست خلجان سے دو چار تھی۔

میں نے ان کو ٹھنڈا کرنا چاہا... ہاں یہ ہی تو میں تم کو بتا رہی تھی کہ یہ منحصر ہوتا ہے معاملے کی نوعیت اور اس بات پر کہ یہ ہمارے مفاد میں ہے... یا... یا۔

تم گھبرا رہی ہو الفاظ تمہارا ساتھ نہیں دیں گے... اور... میں دیکھ رہی ہوں... بہت دن سے اندازہ لگا رہی ہوں تمہارے یہاں... یہاں اس جگہ (اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر جگہ کا تعین کیا) نرم گوشہ پیدا ہو رہا ہے... (اس کی آواز میں غصے اور احتجاج کا ارتعاش تھا۔ اس نے الجھ کر سیاہ چشمہ اتار کر اپنی مخروطی انگلیوں میں تھام لیا اس کی سبز آنکھیں شعلہ بدامن تھیں۔

''نرم گوشہ!'' میں ہنسی تھی... کیا کہہ رہی یار خضریٰ... ذرا سوچو تو۔ جہاں ایک

بدبخت پہلے ہی اپنی سنگین اور جامد مورتی ایک پختہ استھان تیار کرکے اس پر جما گیا ہے... اور... خود نہ جانے کس جہان میں گم ہوگیا ہے وہاں کسی نرم گوشے کی گنجائش ہی کب رہ جاتی ہے...''

''پھر! پھر یہ سب کیا ہے۔'' وہ ابھی تک جھنجھلائی ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں...'' مجھے اس استھان کی سنگینی پر پورا یقین تھا۔ جس کو سنگ خارا اور چونے اور گچ سے بھی زیادہ پائیدار مایوسیوں نے تعمیر کیا تھا۔

ہماری بُیس آگئی تھیں۔ ہم نے اپنے اپنے روٹ پکڑے اور چل دیے۔ امی جان نے لکھا تھا کیا تم کچھ دن کی رخصت پر آ نہیں سکتیں۔ بیٹی ان دنوں میرا جی بہت گھبراتا ہے۔ زندگی بہت بے اعتبار ہوگئی ہے۔ اور دن بدن ہوتی جائے گی۔ ہم سوتے ہیں تو برے برے خواب دیکھتے ہیں۔ جاگتے ہیں تو طرح طرح کے وہم گھیرتے ہیں۔''

میرا جی بھی گھبرا اٹھا تھا۔ امی جان سچ ہی تو کہتی ہیں۔ گھر کے اندر بیٹھے رہو یا باہر چل پھر رہے ہو یا بس میں سفر کر رہے ہو۔ بس ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔ ابھی دوسرے لمحے نہ جانے کیا سے کیا ہوجائے۔ تو چنانچہ میں نے ایک ہفتے کی چھٹی درخواست دی۔ اور اس کے ساتھ ہی خضریٰ پر وحشت طاری ہوگئی... اب تم جا رہی ہو... اور میں اکیلی کام کروں گی، اکیلی بس پر جاؤں گی۔

لیکن میرا اور تمہارا روٹ مختلف ہے۔ ہم الگ الگ بسوں میں سفر کرتے ہیں۔

پھر بھی اخلاقی مدد تو ملتی ہی ہے... حوصلہ تو بندھا رہتا ہے۔ اور جانے اب تم آؤ تو... میں۔ میں... ہاں بھئی دیکھ لو۔ کیسا وقت آن لگا ہے۔

کیوں ایسی باتیں کر رہی ہو خضریٰ... جاتے وقت میرا دل اتنا تو برا نہ کرو... پھر میں بھی تو ریل پر سفر کروں گی... اور۔

''اچھا... اچھا بس آگے نہ بولو۔'' خضریٰ نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا... اصل بات یہ ہے کہ ان دنوں ہم کچھ زیادہ ہی وہمی ہوگئے ہیں۔

اگلے دن آفس جانے کے بجائے میں ضروری شاپنگ کرنے گئی تھی۔ واقعی ہم

کافی دن بعد اکٹھا ہوں گے...امی نے لکھا تھا۔میں نے نجو کو بھی لکھا ہے کہ وہ بھی کچھ دن کی چھٹی لے کر آجائے...میں سب کو بہت سے سرپرائز دینے کے موڈ میں تھی تو چنانچہ شاپنگ کے لیے باقاعدہ نکلی تھی...بس سے اترتے ہی جو شکل سب سے پہلے نظر آئی وہ اسی نمانے جیسے کی تھی، کچھ افسردہ افسردہ سا اترا تھا۔

ہیلو...غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکلا۔اس لیے کہ خضریٰ نے اس کے بارے میں خاصا تعصب سا پیدا کر رکھا تھا...ویسے وہ بہت دن سے آفس میں نظر بھی نہ آیا تھا۔ اب جو شخص روز نظر آئے اور پھر بہت دن نظر نہ آئے، اور پھر اچانک اس سے مڈبھیڑ ہو جائے تو خوشی سی تو ہوتی ہی ہے...اور منہ سے ہیلو بھی نکل جاتا ہے۔

''آج آفس کے بجائے یہاں کیسے...'' اس نے بھی غیر ارادی طور پر سوال کیا تھا...

''میں نے چھٹی لی ہے...گھر جا رہی ہوں۔ امی جان نے بلایا ہے۔ ان دنوں وہ بہت گھبرا رہی ہیں...'' پتا نہیں کیوں غیر ضروری طور پر تفصیل منہ سے نکلتی چلی گئی...''اور...اور آپ یہاں! میں نے تعجب سے دیکھا۔ اس وقت؟''

دوائی لینے نکلا تھا۔ میری امی جان بہت بیمار ہوگئی ہیں۔ اور دوائیں تو مل گئی ہیں، انجکشن تلاش کے باوجود نہیں ملے۔ اس نے نسخہ غیر ارادی طور پر نکال کر دکھایا۔

افسردہ سا، مایوس سا وہ گردن اٹھا اٹھا کر یوں دیکھ رہا تھا جیسے انجکشن سامنے سڑک پر چلتے پھرتے نظر آجائیں گے۔ میری نظر اس کے گلے میں پڑے تعویذ کی طرف اٹھ گئی۔ چاندی کا میلا سا تعویذ سیاہ ڈورے میں بلا ہوا تھا۔

میں نے انگلی تعویذ کی طرف اٹھائی اور معترض آواز میں کہا۔

''یہ تعویذ آج کیوں ڈال لیا ہے گلے میں۔''

''ارے یہ...یہ تو ہمیشہ سے میرے گلے میں پڑا ہے۔ آپ نے خیال نہیں کیا... یہ تو میری امی جان کبھی اتارنے ہی نہیں دیتیں۔''

وہ شرما گیا...میری حفاظت کا بڑا خیال رہتا ہے ان کو۔

واقعی میری نظر آج ہی اس تعویز پر پڑی تھی۔ دفتر کا کام تھا ہی ایسا کہ کدھر کو دھیان ہی نہ جاتا تھا۔ ہر دم ایمرجنسی سی طاری رہتی۔

ایک بار تعویز پر سے نظر ہٹی اور دوسری بار جو اٹھی تو وہ لپ لپ کرتا سامنے والے میڈیکل اسٹور کی طرف سڑک کراس کر کے جا رہا تھا۔ میں شاپنگ پلازہ میں گھس گئی۔

عجب طرح کی آواز تھی، عجب انداز کا لرزہ تھا، عجب طور کا ہنگامہ تھا۔ جو بیان میں نہیں اسکے گا۔ ہرگز ہرگز نہیں۔

جو کچھ ہوا تھا۔ سڑک پار اسی جانب ہوا تھا۔ میں پلازہ سے بھاگتی ہوئی نکلی۔ رکے ہوئے ٹریفک کے ہجوم کو چیرتی پھاڑتی دوڑتی... مجھے یاد ہے کسی نے میری بانہہ پکڑ کر روکنے کی کوشش کی تھی۔

ادھر مت جاؤ... ادھر...

میں نے ایک جھٹکے سے کہنی مار کر روکنے والے کو پرے دھکیلا تھا۔ ہٹ جاؤ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میں اس منظر کو دیکھتی تھی۔ اب کیا کہوں کیا دیکھتی تھی... کچھ نہیں بیان، کر سکتی البتہ ایک بات ضرور یاد ہے۔

بچپن میں چاندنی راتوں میں ہم ایک کھیل کھیلا کرتے تھے۔ سارے بچے گھیرا ڈال کر کھڑے ہو جاتے۔ پھر ایک کمر جھکی بڑھیا (وہ بچہ ہی ہوتا) لاٹھی ٹیکتی چاروں اور کچھ ڈھونڈتی کھوجتی گھیرے میں داخل ہوتی۔

بڑھیا۔ بڑھیا کیا ڈھونڈتی۔

بچے سوال کرتے... سوئی! جواب ملتا۔ پھر بچے سوال کرتے... بڑھیا جواب دیتی۔ لمبا ہی سلسلہ چل پڑا، سوالوں کا، جوابوں کا۔ اب اس وقت بھی ہزاروں سینکڑوں کے گھیرے میں ان گنت بوڑھی عورتیں اور بوڑھے باپ جھکے جھکے، بیٹھے بیٹھے کچھ کھوجتے تھے۔ پر یہ رات نہ تھی چٹا دن تھا۔ چاند کی ٹھنڈی کرنوں کی چاندنی نہ تھی، دھواں تھا۔ بارود کی بو تھی جیسے کسی نے ہزاروں انار جلا کر بجھا دیے ہوں... پھر اچانک

یہ ہوا جھکی جھکی بوڑھی عورتوں کو دیکھ کر مجھے ہنسی آنے لگی تھی۔ پھر میں بھی جھکی اور جھکے جھکے کچھ کھوجنے لگی کھوجتی گئی کھوجتی گئی حتیٰ کہ ایک پولیس کانسٹیبل نے میرا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا۔

''بی بی کیا تلاش کر رہی ہو؟''

ہیں! کیا؟ میں نے چونک کر سوال کیا۔

کیا کھوج رہی ہو؟ وہ دھاڑا۔ سوئی!...اب میں کیا کہتی کہ نمانے جیسے کو ڈھونڈتی ہوں۔

ہیں۔ اب اس کے چونکنے کی باری تھی۔جھڑک کر بولا۔

''یہ کون سا موقع ہے سوئی ڈھونڈنے کا۔ چلو ہٹو یہاں سے۔ لوگ شک کریں گے۔''

شک...مگر اس کے...اس کے گلے میں چاندی کا میلا سا تعویز تھا۔سیاہ ڈورے میں بلا ہوا۔

''سوئی۔تعویذ گلے میں، میلا سا چاندی کا۔سیاہ ڈورے میں بلا ہوا۔''

کانسٹیبل مجھے ہمدردی سے دیکھتا ہوا بولا۔

دماغ پر اثر ہوگیا۔ بچاری کے۔ہوگا کوئی بہت۔

''ہاں نمانا جیسا''... پھر میرے آنسو چل پڑے۔پھر چلتے گئے... چلتے گئے... چلتے گئے۔

اس گلی میں ایک مجلسی زندگی جنم لے رہی ہے۔

اور یہ سب میرے لیے حیران کن ہے۔

اس لیے کہ اب انگلیوں پر گننے کے باوجود میں یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ کتنے سال، کتنے ماہ اور کتنے دن ہوئے جب اس گلی سے مجلسی زندگی کا خاتمہ ہوا۔ اور اس رنگا رنگ طویل وعریض میورل کو اتار کر جیسے سرد خانے میں ڈال دیا گیا جسے دیکھنے کی میری آنکھوں کو عادت تھی۔

میں اپنی اس طمانیت کا اظہار الفاظ میں کرنے سے قاصر ہوں جو ٹربائن اور پانی کی تلت کے بارے میں گھڑی گھڑی ملنے والی خبروں سے محسوس کر رہی ہوں۔

تو گویا ایک بار پھر خبر سفر کرنے لگی ہے۔ اس علاقے کے مکینوں کے گرد و پیش سے رشتہ استوار ہو رہا ہے اور وہ قدیم مواصلاتی نظام (جو نہ جانے کب سے چلا آتا تھا) بحال ہو رہا تھا۔

بس میں اتنے پر ہی مسرور اور مطمئن ہوئے جا رہی ہوں۔ اور مجھے بالکل علم نہیں کہ اس کے بعد بھی کچھ کلائمیکس آئیں گے یا آنے والے ہیں۔

پہلے کلائمیکس کا آغاز۔

اس خبر کے ساتھ ہوا کہ اگرچہ نیا ٹربائن پڑ چکا ہے مگر نئی پائپ لائن ڈالنے میں ابھی دو یا تین دن لگیں گے۔ اس دوران ہر روز ایل ڈی اے کا ایک، نیا ٹینک پانی دینے آیا کرے گا... اور پانی کے ٹینک اور اس کی میل لمبی ہوز کے استقبال کو نہ صرف علاقے کے بچے پانی کی بالٹیاں اٹھائے لمبی قطار میں لگنا شروع ہوگئے بلکہ وہ تمام خواتین بھی جو گیس برنروں، فریجوں، واشنگ مشینوں اور وی سی آر وغیرہ کی آمد کے ساتھ اتنی مصروف ہوگئی تھیں کہ گلی میں پیدل چلتی نظر ہی نہ آتی تھیں، آج اپنے اپنے گھروں کے لوٹے، بالٹیوں کی دفاعی لائن کے طور پر قطار بندی میں شرکت کے خیال سے نکل پڑی تھیں۔ میں نے چھت کے ایک ایسے خفیہ گوشے سے، کہ جہاں سے میں خود کسی کو نظر نہ آسکوں اور سب کو بخوبی دیکھ سکوں، اچھی طرح دیکھا تھا کہ ان کے

شیر دہان

گرجا والے بڑے اسکول کی بائیں طرف کو سڑک مڑ کر گلی میں داخل ہو جاتی تھی یا پھر گلی موڑ کھا کر سڑک پر چلی آتی تھی۔ چھوٹی سی مختصر سی گلی تھی جس پر ریڈیو ٹرانسسٹر کی مرمت کی دکانیں تھیں (دو چار وہ بھی بہت معمولی، گرد آلود) ایک دکان جو ریفریجریٹروں کے چھوٹے سے شوروم کی طرح استعمال ہوتی تھی۔ایک مرتبہ غم و غصہ کے کسی اظہار کے موقعے پر پبلک نے مٹی کا تیل (ہو سکتا ہے پٹرول ہو) چھڑک کر ماچس کی تیلی اس پر پھینک دی۔ (تیلی پھینکنے والے کو شاید یہ پتا بھی نہ ہوگا کہ شوروم کے مالک نے اپنا سارا جی پی فنڈ اور انشورنس پالیسی فروخت کر کے یہ شوروم بنایا تھا۔ ابھی دو ہی فریج نکلنے پائے تھے (خیر بعض لوگوں کا خیال تھا کہ دشمنی اور حسد کا نتیجہ تھی یہ حرکت، بہرحال وہ دل پکڑ کر رہ گیا) قالینوں کے ایک شوروم میں سیلز مین کے طور پر ملازمت کرنے لگا... کہتے ہیں ایک دن گاہک کو قالین دکھاتے دکھاتے وہیں لیٹ گیا، پھر نہ اٹھا۔ جملۂ معترضہ کچھ زیادہ ہی لمبا ہوگیا۔ورنہ کہنے کی صرف یہی بات تھی کہ اسی دکان کے عقب میں پتلا سا گیلری نما سرہیرا تھا۔اسی میں برسوں سے ایک دبلا پتلا سا شخص سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی دکان لگائے بیٹھا تھا۔

سرہیرے یا گیلری نما کمرے کے چاروں طرف اونچے اونچے لکڑی کے ریکوں پر کتابیں لگا کر جماعتوں کی نشان دہی کر دی تھی۔ گتے کے چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑوں پر... میٹرک، ایس سی (سینئر کیمبرج) غرض کے جی ون سے میٹرک اور ایس سی بلکہ ایچ ایس سی کی کتابیں بھی دستیاب تھیں۔

لوگوں کو تعجب بھی ہوتا تھا کہ یہ کیا بات ہے کہ مارکیٹ اور بڑی بڑی دکانوں میں تو کتاب ملے نا... مگر اس پرانی سیکنڈ ہینڈ دکان پر کبھی یہ جواب سننے میں نہ آیا کہ کتاب نہیں ہے۔ بات یہ کہ بچوں اور دکاندار کے درمیان معاہدہ رہتا تھا کہ نتیجہ سنتے ہی پورا کورس بندھا ہوا مجھے دے جاؤ، پھر دیکھو تم جو کتاب مانگو گے ملے گی۔ یقینی طور پر پاس ہونے کا اندازہ لگا لینے والے بچے (نتیجے والے دن) پیچ ڈے کو پورا کورس بندھا ہوا ساتھ لاتے۔ وہ اس کے بدلے میں اگلی جماعتوں کے کورس لے لیتے کچھ رقم کے اضافے کے ساتھ۔ اسکول کے بچوں نے کبھی اس کا نام جاننے کی بھی کوشش نہ کی۔ وہ ''کتابوں والے سر'' کے نام سے مشہور تھا۔ تقریباً ساڑھے تین فٹ کا قد، دبلا پتلا، سیدھا پاجامہ، پرانی وضع کی دھاری دار قمیص۔ چھوٹی سی فرنچ کٹ ڈاڑھی... ذرا اندر کو دھنسی چمک دار ہنستی ہوئی آنکھیں، آنکھوں پر عینک... منہ میں پان... دل میں بے پناہ قناعت کا دریا موجزن... کتابوں کے ہجوم اور انبار میں دبا بیٹھا رہنے والا یہ شخص... بچوں کے لیے خاصے کی چیز تھا... اسکول سے نکلے، گاڑی یا بس کے آنے میں دیر ہوئی اور دکان میں جا گھسے۔

صرف کورس ہی نہیں بکتا تھا یہاں، اس دکان میں کومکس اور کہانیاں، ہانس کرسچن کی کہانیوں کی رنگین تصویروں کتابوں سے لے کر چارلس ڈکنز، ہارڈی، شیکسپیئر اور برنارڈ شا کے علاوہ شارلٹ برونٹے، ڈیفنی دی ماریئر اور ڈینس روبنس تک دستیاب۔ اور میٹرک اور ایس سی کی لڑکیاں شہد کی مکھیوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی تھیں۔

دکان کا تمام تر چارج کتابیں تلاش کرنے سے لے کر گلے میں پیسے ڈالنے تک کا عمل بچوں ہی کے ہاتھ میں رہتا۔ بیک وقت چار چار پانچ مل کر الماریوں کے

اوپر تختوں پر بیٹھے ہوتے... کتابیں ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔ ساتھ پڑھ بھی رہے ہیں... یہ بھی ہر قسم کی شرارتوں اور غوغا کے درمیان بڑی طمانیت سے اکڑوں بیٹھے ہیں۔ خود ہی کتابیں چھانٹ رہے ہیں۔ یا پرانی کتابوں کی جلدیں باندھ رہے ہیں۔ البتہ کھانا کھاتے وقت بچوں سے لڑنے لگتے... ''ارے نوالہ حلق سے نہیں اترنے دیتے۔ پانی کا گھونٹ بھی نہیں پینے دو گے؟ نالائقو۔''

پھر بچوں ہی کے مشورے سے کتابیں کرائے پر بھی دینے لگے۔ بس ایک چونی تھما کر اچھی سے اچھی کتاب پڑھنے کو مل جاتی۔ ویسے ان کی طبیعت میں کاروباری ہتھکنڈے بالکل نہ تھے۔ چاہتے تو خود ہی آئس کریم رکھ لیتے... مگر انھوں نے ایک بہت نادار شخص کو اجازت دے رکھی تھی کہ دکان کے آگے والے تھڑے پر بیٹھ کر آئس کریم بیچ لیا کرے۔ اسی طرح مصالحے والے، چنوں اور چپس والے کو بھی کبھی نہ ٹوکا کہ کیا آنے جانے کا راستہ روک کر بیٹھ جاتے ہو۔ ایسے لفافے تو میں خود رکھ لوں گا۔

ایسی ہلا چلی، غلغل اور بچوں کی معصوم مصاحبت میں کچھ احساس ہی نہ ہوا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ چونکے تو اس وقت جب یہ محسوس ہوا کہ وہی لڑکے جو پہلے بندوں کی طرح کتابوں کی الماریوں پر چڑھے یا نیچے اکڑوں بیٹھے دکان کو اتھل پتھل کرتے تھے، اب اپنے بچوں کی انگلیاں پکڑے کتابوں کی تلاش میں آنے لگے ہیں... پھر وہ ننھے منے بچوں کو بتاتے۔ یہ تمہاری امی تو بالکل ہی بندریا تھی، غصہ آجاتا تو لڑنے والے لڑکوں کا منہ نوچ لیتی... اف اللہ آئس کریم کتنی کھاتی تھی... اچھا... اچھا۔ یہ تمہارے ابو ہیں۔ پہلے تو بالکل خرگوش ہوا کرتے تھے۔ بس سر پر کان نہیں کھڑے تھے۔

ماؤں، باپوں کو کتنا اچھا لگتا تھا۔ کوئی کس پیار سے ان کے بچپن کی واردات بیان کرتا تھا۔ ایسے میں بھی بہت وقت گزر گیا۔ دکانوں کے کتنے بورڈ بدل گئے۔ کتنی نئی دکانیں کھل گئیں۔ حد یہ کہ مشروبات کے نام تک نئے نئے آنے لگے۔

کون سی کولا... کون سی کولا... یہ کولا، وہ کولا...

کتابوں والے سر کا بچوں سے بڑا مذاق چلتا۔

آج کون سی کولا پی کر آئے ہو؟ پتا ہے ایک نئی بوتل چلنے والی ہے... ڈریکولا!... سر سے پیر تک ڈرا کر کپکپی چڑھا دینے والی۔

''ارے بھائی تم اتنی کولائیں پیتے ہو، کبھی لغت میں بھی یہ دیکھا کہ اس کے معنی کیا ہیں! پینے سے اس لفظ کا کیا تعلق بنتا ہے؟''

''آپ بتا دیں سر...''

''لو بھئی میں کیوں بتا دوں؟ میں کیا یہ کولائیں پیتا ہوں۔''

''ارے بھائی ڈکشنری میں تلاش کرو۔ ڈکشنریاں، دیکھنا سیکھو... پھر پیو... ڈکشنری دیکھو، لغت دیکھو بڑے کام کی چیز ہے۔''

بچے آکسفورڈ ڈکشنریوں کے پاکٹ ایڈیشنوں پر ٹوٹ پڑتے... پھر اس سلسلے میں ڈکشنریاں بک بھی جاتیں۔ دو ڈھائی حد تین روپے میں ڈکشنری ان کی جیب میں پہنچ جاتی۔

وقت دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔ اور کتابوں والے سر کے پاس اتنی مہلت نہ تھی کہ اس کی رفتار کا احساس کر سکیں۔ بس کبھی کبھار منہ اٹھا کر دیکھتے تو ایسا لگتا جیسے اس جگہ کی اہمیت بڑھ رہی ہے۔ قیمت بہت زیادہ ہوگئی۔ ہر طرف زندگی کی نت نئی غیر ضروری ضروریات کی دکانوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آزو بازو پلازے اور پینوراما ٹائپ عمارتوں کے بننے کی آوازیں آنے لگی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں لیے بیٹھے لوگوں پر ایک سہم سا چڑھا رہنے لگا۔ مگر کتابوں والے سر کو کیا پرواہ تھی۔ اس اندھیرے، کتابوں اور پرانے کاغذ کی مخصوص بو والے سر ہیرے کو کون پوچھے گا۔ وڈیو فلموں، کیسٹوں اور وڈیو گیمز کی دکانیں ابھرتی ہیں ابھریں۔ میری سستی لیکن بے بہا کتابوں کی کشش بچوں کو ادھر ہی لائے گی۔ وہ مطمئن رہے۔ ویسے بھی طبیعت میں بے صبری، بے چینی نہ تھی۔ ایک جمود سا تھا جو وجود پر طاری رہتا۔

پرانی کتابوں سے پٹی... سیکنڈ، تھرڈ بلکہ فورتھ ہینڈ کتابوں کی وہ گیلری بلکہ سر ہیرے نما دکان، ہزاروں روپے ماہانہ پر جس دن اٹھی تو وہ ذرا بھی نہ چونکے۔ افسردہ

بھی نہ ہوئے۔دل کی حالت تو خدا ہی بہتر بتا سکتا ہے۔مگر یہ کہ چہرے پر شکن بھی نہ آئی۔دکان کے مالک اور نئے کرایہ دار سے زبانی کلامی Stay لیا۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ کس سرگردانی اور تگ و دو سے دو چار ہوئے ہوں گے۔

آس پاس کی ساری ہی دکانیں دھڑا دھڑ چلتی تھیں، خاصی رونق رہتی تھی۔خاص کر درزی خانے میں گاہک پر گاہک ٹوٹتا... اس علاقے میں یہی چار چھ دکانیں تھیں نہ بڑی نہ چھوٹی، البتہ بائیں ہاتھ کی تیسری دکان۔کہتے ہیں شیر دہان تھی آگے سے کھلی (شیر کے منہ کی طرح) پیچھے سے پتلی۔کوئی دس سال سے اس کی زنجیر میں موٹا سا زنگ خوردہ قفل پڑا رہتا تھا... بس وہی ایک دن آکر توڑ ڈالا۔ ایک چھوٹی سی بالٹی میں قلعی کا چونا تھا۔ پیلا رنگ ملا ہوا ایک نئی سی کوچی۔ خود ہی دکان میں سفیدی کر ڈالی۔ مدتوں بعد دکان کو رنگ روغن ملا تو جیسے ہنس پڑی، جیسے شیر نے اپنا دہان کھول دیا ہو۔ پیچھے سے ایک ریڑھی پر لدے کتابوں کے بنڈل آتے گئے۔ دن بھر ٹھونک پیٹ کرتے الماریاں فٹ کرتے گزر گیا۔پسینے میں تر بتر ایسے کہ کرتا اتار کر نچوڑ لو۔ پھر بھی دل ویسا ہی ٹھنڈا تھا، عجب دل تھا، عجب دماغ تھا، ہراساں ہوتا ہی نہ تھا۔لوگ تھے کہ تین تین چار چار مددگاروں کے ہوتے ہاتھ پاؤں پھولنے لگتے۔ وہ اللہ کا بندہ اکیلا ہی چپ چاپ اپنی کتابیں جماتا رہا۔بعضے بعضے بنڈلوں پر تو برسوں برسوں کی گرد جمی تھی۔پرانے وقتوں کے انگریزی رسالے، کروشیا کے کام،کڑھائی، بنائی، کراس سٹیچ کے کاموں کے،مگر اب بیبیاں خود کرتی ہی نہیں کچھ۔خود پڑھتی ہیں یا پڑھاتی ہیں۔ بال سیٹ کرواتی ہیں اور ہر چیز، حد یہ کہ ٹکوزیاں تلک ریڈی میڈ بنی بنائی خرید لاتی ہیں۔بس ان ہی بنڈلوں پر سالوں کے حساب سے گرد کی تہیں جمی تھیں۔ کوئی پوچھتا نہ تھا ان کو۔ کاغذ پیلے پڑتے پڑتے خاکستری ہونے لگے تھے۔ایسی تمام کتابیں اور رسالے ترپالوں میں باندھ کر کباڑیوں کے لیے الگ رکھتے گئے۔

تب ہی خواجہ قسیم نے آکر معمولی صاحب سلامت کے بعد... اس دکان کی شیر دہانی کے قصے سنانے شروع کر دیے۔

''یہ دکان چلتی ہی نہیں... کبھی نہیں چلی۔''

پریوں کے دیس سے آئے ہوئے بونے جیسا انسان (اسکول کے بچوں کے کتابوں والے سر کے بارے میں یہی ریمارکس ہوتے تھے) مسکرایا۔

بچوں کی صحبت میں رہتے رہتے... کتابوں والے سر کی حسِ مزاح بہت بڑھ گئی تھی۔

''ارے صاحب، یہ تو شیر دہان ہے۔ کہتے ہیں جو عمارت، جو دکان حدیہ ہے کہ بسے بسائے مکانوں میں بھی جو کمرہ یا دالان شیر دہان ہو وہ اپنے اندر کسی کو آباد نہیں ہونے دے گا، فلاح نہیں پانے دے گا۔ خود کھنڈر بن جائے گا مگر بستی کو برداشت نہیں کرے گا۔''

خواجہ قسیم کو جواب دینے کے بجائے... دل میں سوچ رہے تھے۔ تو کیا میری وہ پتلی لمبی گیلری نما دکان بھی ایک دم ہی شیر دہان ہوگئی ہے۔

اگرچہ یہ دکان بھی اسکول سے بہت فاصلے پر نہ تھی لیکن درمیانی سڑک پر گاڑیوں، بسوں اور ویگنوں نے ایک دم ہی تیز چلنا شروع کر دیا تھا۔ یا پھر یہ بات تھی کہ پہلے بچوں کے ہجوم اور غلغل میں ایسی باتوں پر نظر ہی نہ پڑتی تھی... اور اسکول کی اس قریبی گلی سے ان کی موجودہ گلی تک آنے میں دو زیبرا کراسنگز پڑتی تھیں۔ جن کے سرے پر وہ خود ہی آدھا آدھا گھنٹہ راہ کھلنے کے انتظار میں ہی کھڑے رہتے۔

مسخری مسخری ہنستی ہوئی شکلوں، بندروں جیسی عادتوں والے، ساری دکان کی، کتابیں بکھیرے دینے والوں سے فراق کا سبب بن گئی تھیں، یہ تیز رفتار گاڑیاں اور مصروف راہیں۔ کچھ عرصہ تو دکان جمانے اور ٹھیک ٹھاک کرنے میں ہی گزر گیا۔ لیکن فرصت سے بیٹھنے کے بعد وہ چہرے، وہ شوخیاں بہت یاد آئیں، ملول سے رہنے لگے۔

پھر ایک اور بات کا احساس ہونے لگا کہ اب بچوں کو سیکنڈ اور تھرڈ ہینڈ نصابی کتابوں سے دلچسپی نہیں رہی۔ نہ پرانا کورس دیتے ہیں، نہ لیتے ہیں، حالانکہ اسکول زیادہ دور نہ تھا۔ اب ان کو چونّی دے کر کتابیں چاٹنے کا چسکا بھی نہ رہا تھا۔ حالانکہ آتی دفعہ

دکان کی تبدیلی اور نئی دکان کا پتا چھپوا کر پرچے ان اسکولوں میں تقسیم کر آئے تھے جہاں جہاں ان کی کتابیں جاتی تھیں۔

پھر یہ محسوس ہونے لگا کہ اب کوئی چارلز ڈکنز، ہانس کرسچین اور کیٹس کو نہیں پوچھتا۔ شیکسپیئر اور شا کی جلدیں اپنی جگہ پر ٹھیک ٹھاک رہنے لگیں... کیا تو حلق سے نوالہ اتارنا مشکل تھا... کیا اتنی فرصت رہنے لگی کہ دکان کے بیچوں بیچ آرام سے چٹائی پھیلا کر اطمینان سے سوتے رہتے...

خواجہ قسیم کو جب بھی موقع مل جاتا آ بیٹھتے، اِدھر اُدھر کی بات اور پھر وہی بات...

یہ شیر دہان ہے۔

یہ چلے گی نہیں... وہ بھورے مرزا کا حال یاد ہے... وہ کسی پاس بیٹھے سے گواہی حاصل کرنے لگتے...

بس مکھیاں ہی مارا کرتے... اونگھتے رہتے تھے۔ دکان میں بیٹھے، گھر والی نکل گئی تھی... تنگدستی سے گھبرا کر۔ دس سال کا ایک لڑکا بھی۔

بس ایک دن تانگہ بلایا... لڑکے کی انگلی پکڑی۔ بکسا تانگے میں دھرا... اور ایسی گئی کہ شکل نظر نہ آئی بھورے مرزا کو...''

وہ اس قصے سے گھبرانے لگے۔

''یار کوئی اور بات کرو... تمہاری باتیں سن کر برے برے خواب آتے ہیں۔ جیسے بڑے بڑے سیلاب آرہے ہوں اور میری ساری کتابیں ان کی لہروں کے ساتھ بہی جا رہی ہوں۔ تھوڑا وقت اور گزرا تو کورس کی پرانی کتابوں کے علاوہ انھوں نے وقت کی ضرورت سمجھ کر اردو کے رسالے، اردو کی کتابیں رکھ لیں۔ اونچی قسم کے افسانے، اعلیٰ درجے کی ناولیں، کلاسیکی شعراء کے مجموعے، نئی تنقیدیں، نئی شاعری۔ سب ہی کتابیں پرانی کتابوں کی صورت میں جمع کرلی تھیں۔ بعض وقت وہ حیران ہو کر کہا کرتے تھے۔

''یہ ایسی کتابیں لوگ بیچ کس دل سے دیتے ہیں۔ وہ بھی الماری میں اپنی اپنی جگہ مقیم رہیں۔ اگر کوئی کبھی ہاتھ میں لے کر قیمت پوچھ لیتا تو لرز کر واپس رکھ دیتا... پرانی کتاب اور اتنی گراں۔'' وہ بھی اب ذرا تیزی سے جواب دینے لگے تھے۔

''دنیا بھر کی گراں چیزیں تو فخریہ خریدیں گے۔ مگر کتاب کہ جس میں لطافتِ خیال اور دانش کے موتی ہوں گے، دس پانچ کی بھی مہنگی لگتی ہے۔''

پھر وہ سمجھانے لگتے۔

''بھائی میں سستی کتاب اس لیے بیچتا تھا کہ پرانی کتابوں والے کوڑیوں کے مول بیچتے تھے... میرے ہاتھ، اور اب میں اتنی مہنگی خریدوں تو...''

وہ رک جاتے... خیر چلو اب نیا تجربہ بھی کرتے ہیں۔ خیال میں آتا۔

دکان میں جاسوسی ناولیں، رومانی رسالے اور ڈائجسٹ نظر آنے لگے... ان کے دو چار پچھلے ملنے والے جو زیادہ تر چونّی دے کر پڑھتے، پھر راہ و رسم بڑھ جانے پر دکان میں بیٹھ کر فری مطالعہ کرنے لگے (دکان میں بیٹھ کر پڑھنے والوں کا ان کے یہاں کوئی معاوضہ نہ تھا)... اعتراض کرتے۔

''یہ کیا یار... لا کر جمع کر لیا۔ ریڈر کا مذاق بگاڑ دو گے۔''

یہ تمہارا قاری رہ کہاں گیا ہے۔ وہ تو اب ناظر ہے۔ ناظر بس دیکھتا ہے۔

کتابوں والے سر کی عادت نہ تھی کہ وہ کسی نئی چیز کے تعارف سے گھبرائیں یا اسے ہدفِ ملامت بنائیں۔ یہی سبب تھا کہ انھوں نے کبھی وی سی آر یا وڈیو کو (اگرچہ پہلو والی گلی میں وڈیو گیمز کی دکان کھل چکی تھی اور بچوں کو اس درجہ متوجہ کر چکی تھی کہ چھٹی کے اوقات میں ادھر ہی امنڈتے تھے) الزام نہ دیا۔ وہ تو یہ کہا کرتے تھے۔ ارے بھائی یہ تو مشینیں ہیں۔ یہ بھلا آدمی کا کیا بگاڑ سکتی تھیں۔ بھلا کیونکر چڑ بیٹھیں وہ تو آدمی نے خود ہی اپنے آپ پر چڑھا لیا ہے ان کو بلکہ خود چڑھ بیٹھا ہے۔ ارے یہ مشینیں تو بڑی کام کی ہوتی ہیں۔ انسانی عظمتوں اور قوتِ تسخیر کا نشان... ان کو بھی غلط غلط طریقے پر استعمال کر کے ذلیل کر رکھا ہے (جب سے کتابوں کی دکان پر

بیٹھے پڑھا ہی کرتے تھے۔ ذرا وقت ملتا اور مطالعہ شروع ہو جاتا اس لیے بے تکان بول لیتے تھے مگر عام حالت میں کم سخن ہی نظر آتے)

ان کو بڑی ناراضگی تھی۔ ''یہ بہت ہی نیا آدمی اپنی مشینری سے کام نہیں لے رہا ہے۔ ان مشینوں کے ہاتھوں بیچ دیا ہے۔''

وہ ریڈر شپ کی کمی کا رونا بھی نہیں روتے تھے کہا کرتے تھے، ''یہ وقت کی آواز ہے... بس اب کتاب کا عہد ختم ہوا۔''

کسی نے ایک مرتبہ مشورہ دیا کہ علاوہ کتابوں کے کچھ کیسٹ وغیرہ رکھ لو۔ کچھ اور جنرل اسٹور والا سامان لگا دیکھو...

غصہ تو آتا ہی نہ تھا۔ چیں بجبیں نہ ہوئے۔ پان چباتے چباتے بس اتنا کہا۔ ''نہیں بھائی... ملوث نہیں کروں گا اس کام کو کسی دوسری چیز سے۔ کتاب تو بس کتاب ہے، اس کا ایک تقدس ہے۔''

بس ایسی ہی باتیں کرتے کرتے ڈاڑھی کڑبڑی ہوئی اور پھر بالکل ہی جھک سفید ہوئی۔

بس ایک دفعہ ہی دکان پر بیٹھنا موقوف کر دیا۔ یہ بات نہیں۔ مرے مرائے نہیں تھے۔ بس جیسے دل ہی مر گیا تھا۔

بہت مہینے گزر گئے تو ایک نوجوان نے آکر دکان کا تالہ کھولا۔ ترپالوں سے ڈھکے کتابوں کے بنڈل کے بنڈل ریڑھیوں پر لدوا کر کباڑیوں کے پتے دے کر بھیج دیے... سب شیکسپیئر، برنارڈ شا، موپاساں، دوستو وسکی، چارلس ڈکنز، میر، غالب کے نسخے، سرسیّد کی آثارالصنادید، گھر بیٹھے دل کیسا داغ داغ ہوا ہوگا۔ اس افتاد پر، اس نوجوان نے دکان کو نئے سرے سے آراستہ کیا۔ مشہور مشروبات کے بورڈ آویزاں کیے، ایک ایک پر کیسٹ سجائے۔ ایک کاؤنٹر پر کافی کی بوتل پیالیاں اور پرکیو لیٹر دھرا۔ کہتے ہیں دکان تھوڑی تھوڑی رینگنے سی لگی پھر خود کبھی ادھر نہ آئے۔

ایک مرتبہ خواجہ قسیم کو مل گئے تھے۔ راستے میں کہنے لگے، ''میاں تم کہتے تھے

یہ دکان شیر دہان ہے۔''

''میں کہتا ہوں یہ وقت شیر دہان ہے۔ لینے نہیں دے رہا ہے کسی کو۔ کسی کی آباد کاری پسند نہیں آرہی ہے اس کو...

تخریب کاریاں... سازشیں... ریشہ دوانیاں... جنگوں کی دھمکیاں۔ خوں ریزیاں، یہ سب کیا ہیں۔ آباد کاری کے نقشے مٹانے اور بستیوں کو کھنڈر بنانے کے آثار۔

خواجہ قسیم میری مان لو... دکانیں نہیں یہ وقت شیر دہان ہے۔

کتاب جیسی معصوم شے کو بھی کھا گیا، مٹا دیا...''

چہروں پر بیگانگی اور بے تکلفی کے ماسک چڑھے ہوئے تھے۔ اور ان کا آپس میں بے تکلف ہونے کا قطعی ارادہ نہ تھا۔ شاید خواتین کو اپنے اسٹیٹس کا زیادہ ہی لحاظ ہوتا ہے... ''ہم تو صرف پانی لینے کے خیال سے نکل آئیں ہیں۔'' ان کے چہرے صاف پکارتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے ہم کلام نہ تھیں لیکن اپنے فری ی ج کی بوتلوں میں قطرہ پانی نہ ہونے کا ذکر خود کلامی کے انداز میں بڑ بڑا کر کر رہی تھیں۔

''اللہ مارے فری ی ج کی ساری بوتلیں خالی پڑی ہیں۔'' یہ بھی ایک خوب صورت اور رنگا رنگ آئل پینٹنگ تھی۔ گویا، جو مجھے حد بھر محظوظ کر رہی تھی۔ اور مجھے اس سے آگے کے کسی نظارے یا لینڈ اسکیپ کی توقع نہ تھی۔

کتنے عرصے کے بعد! کتنی مدّت کے بعد!

میرا دل چپکے چپکے دہراتا تھا۔

لیکن اس سے آگے یوں ہوا کہ خبر نے پھر ایک آخری سفر کیا۔ یعنی اگلے دن کی دوپہر چڑھنے سے قبل خبر آئی۔ آج رات دس بجے سے پہلے پہلے نلکوں کو پانی دے دیں گے۔

اور اسی سہ پہر کو محلے کے چند نوجوانوں نے نہ جانے کس جذ۔بے کے تحت (میں تو یہی کہوں گی کہ اسی میرے والے جذبے کے تحت) پائپ لائن ڈالنے اور ڈلوانے والوں سے درخواست کی ہے ایک آدھ گھنٹے کو گلی کے نکڑ والے نل کو ٹربائن سے ملا دیں۔ کہ وہ سالہا سال سے بند غسل خانوں میں نہا نہا کر تھک چکے ہیں۔ اور گلی کے نکڑ والے نل تلے بیٹھ کر نہانے کو ترس گئے ہیں۔ میں نے اسی گوشے میں کرسی ڈالے چپ چاپ گلی کے ہر منظر سے رابطہ قائم کیا ہوا تھا۔ کہ نہاتے نہاتے ایک نہانے والے کو جانے کیا سوجھی کہ اس نے ایک بڑا ڈبہ پانی سے بھرا اور سڑک پر رواں ایک سائیکل اور اس کے سوار پر اچھال دی۔ پھر کیا تھا گلی پانی اچھالنے والے جذبوں سے معمور ہوگئی۔ ایک ہجوم تھا کہ نل کے گرد جمع تھا۔

کسی کو ... گھر لے جانے کا ہوش نہ تھا۔ البتہ بالٹیاں بھری جا رہی تھیں۔

نئی آوازیں

الفراق

(شاعری)

اجمل سراج

عشق کے مارے ہوئے

(ناول)

زاہد حسن

محبت کا محل وقوع

(شاعری)

سیّد کاشف رضا

خواہ مخواہ کی زندگی

(افسانے)

رفاقت حیات

اور کہاں تک جانا ہے

(شاعری)

اکبر معصوم

شہرزاد
SCHEHERZADE

نیم وا دریچے

ایک مختلف دُنیا کی جھلک

زیرِ ترتیب ترجمے

ایک ہزار چوراسی کی ماں	(ناول)	مہاشویتا دیوی
شہر میں کرفیو	(ناول)	وبھوتی نارائن
چھاکو کی واپسی	(ناول)	بدیع الزماں
قیدی عورت کی ڈائری	(خودنوشت)	اختر بلوچ
اُس کا بنٹی	(ناول)	منو بھنڈاری

بہترین افسانہ نگاروں کی تحریریں، تنقیدی تعارف کے ساتھ

ہر کتاب، مکمل انتخاب

انتخاب

الطاف فاطمہ	ضمیر الدین احمد
ابوالفضل صدیقی	رفیق حسین

مصطفیٰ کریم

افصل احسن رندھاوا

پیلی چھتری والی لڑکی	ناول	اُدے پرکاش
سترہ کہانیاں	افسانے	امرتا پریتم
دہشت گردی کی ثقافت	مضامین	نوم چومسکی
چچا سام کیا چاہتا ہے	مضامین	نوم چومسکی
افسانے کی حمایت میں	ادبی تنقید	شمس الرحمٰن فاروقی
خیال کی مسافت	ادبی تنقید	شمیم حنفی
ہمہ اوست	ناول	آغا سلیم
اندھیری دھرتی، روشن ہاتھ	ناول	آغا سلیم
جلاوطن	افسانے	نور الہدیٰ شاہ
دوآبہ	ناول	افضل احسن رندھاوا
رات کا رپورٹر	ناول	نرمل ورما
وہ دن	ناول	نرمل ورما
طوفان کی آہٹ	ناول	مصطفیٰ کریم
منتخب افسانے	افسانے	مصطفیٰ کریم
عورت: زندگی کا زنداں	مضامین	زاہدہ حنا
حالی کا ذہنی ارتقا	ادبی تنقید	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں
شاہ لطیف کی شاعری	ادبی تنقید	الیاس عشقی
عالم ایجاد	ادبی تنقید	آصف فرخی
منٹو: نہ نوری نہ ناری	ادبی تنقید	ممتاز شیریں

شہرزاد

SCHEHERZADE

شہرزاد کی مطبوعات دستیاب ہیں: فکشن ہاؤس، مزنگ روڈ، لاہور

زمین کا نوحہ	جوہری تباہ کاری کے خلاف ادب	مرتبہ: ضمیر نیازی
کتاب عشق	تصوف	ترجمہ: پروفیسر لطیف اللہ
آنگن میں ستارے	شخصی خاکے	ڈاکٹر اسلم فرخی
تنقید و تحقیق	تنقیدی مضامین	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان
کہانیاں گم ہو جاتی ہیں	افسانے	فاطمہ حسن
چیخ	ناول	انور سن رائے
راستے مجھے بلاتے ہیں	افسانے	عذرا عباس
زندگی سے کٹا ہوا ٹکڑا	افسانے/نظمیں	ولی رام ولبھ
دیا اور دریا	ناول	افضل احسن رندھاوا
ہالہ	ناول	کارلوس فیونتیس
دل کی تنہائی	افسانے	شیر شاہ سید
جس کو دل کہتے تھے	افسانے	شیر شاہ سید
دل کی بساط	افسانے	شیر شاہ سید
دوسروں کی شاعری	عالمی شاعری کا انتخاب	ترجمہ: ضمیر احمد
دیدۂ بینا	خاکے	نذیر الحسن صدیقی
پرانی نمائش	شاعری	حارث خلیق
نقش فریادی اور حسن	تنقیدی مضامین	مصطفیٰ کریم
باقیات بیدی	منتشر تحریریں	راجندر سنگھ بیدی
اور کہاں تک جانا ہے	شاعری	اکبر معصوم

شہرزاد
SCHEHERZADE

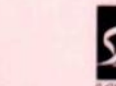

نظم ونثر کے نئے انداز

دنیا زاد

کتابی سلسلہ

سال میں تین کتابیں

خصوصی اشاعتیں

عاشق من الفلسطین

سیاسی سماجی تجزیہ اور نظم ونثر کا انتخاب

دنیا دنیا دہشت ہے

تجربے سے تجزیے تک

میں بغداد ہوں

موجودہ صورت حال کا ادبی تناظر

حمرا خلیق کے ترجمے

سنجوگ

خیبر کی سنگلاخ وادی میں ایک انگریز خاتون کی انوکھی شادی

رسکن بانڈ کا ناول

کبوتروں کی پرواز

۱۸۵۷ کی جنگ کے ہنگام میں عشق کی شوریدہ سری

طالبان کے دیس میں

افغانستان میں ایک بنگالی خاتون کی روداد

شہرزاد
SCHEHERZADE

الطاف فاطمہ ..... عبور دریائے شور کی سزا پانے اور کالا پانی کاٹنے والے علامہ فضل حق خیر آبادی کا خون ہیں۔ وہی طنازی، وہی شان بے نیازی۔ اس لکھن باری نے کیا دھوپ چھاؤں تحریریں لکھی ہیں۔ حزن و ملال کے تجسیمی رنگ میں رنگی ہوئی شگفتگی اور وارفتگی کے قصے، الاچہ اور طرحدار کے ریشمی تھانوں کی طرح آنکھوں کے راستے دل میں اترتی ہوئی کہانیاں۔

کہانیوں، ناولوں اور ترجموں کے انبار لگاتی ہوئی، بچوں کو بھولی بسری اور نوئی نویلی کہانیاں سناتی ہوئی یہ گوشہ گیر لکھن باری نہ فلکسر، نہ گمشنر، نہ کسی ادبی تحریک میں شریک، نہ تحسین باہمی کے کسی دائرے میں شامل، نہ مے سے کام، نہ مے پرستوں سے کام، نہ سر کے گرد روسائیوں کا ہالہ، نہ شانوں پر سرکاری انعام واکرام کا دوشالہ، ایک ایسی جوگن بیراگن کی طرف ادب کے بادشاہ گر نظر بھر کر بھی کیوں دیکھتے۔ سو الطاف فاطمہ اپنی لکھت کی گٹھری کاندھے پر دھرے، ناقدری کا، کالا پانی کاٹ رہی ہیں۔ اردو ناول و افسانے کے پارکھ ان سے اگر سرسری گزرے تو یہ الطاف فاطمہ کا گھاٹا نہیں، اردو ادب کا زیاں ہے۔

زاہدہ حنا

الطاف فاطمہ ۱۹۲۹ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے خاندان میں کئی نامور ادیب پیدا ہوئے جن میں منظر و افسانہ نگار سید رفیق حسین کے علاوہ "نشتر" کے مصنف بھی شامل ہیں جو قرۃ العین حیدر کے مطابق ہندوستان کی کسی بھی زبان میں لکھا جانے والا پہلا ناول ہے۔ الطاف فاطمہ نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے، بی ایڈ کی اسناد حاصل کیں اور لاہور کے اسلامیہ کالج اور اپوا کالج میں اردو کی تدریس سے وابستہ رہنے کے بعد ریٹائر ہوگئیں۔ ان کی کتابوں میں "دستک نہ دو" کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہ ناول ٹیلی ویژن پر قسط وار ڈرامے کے طور پر بھی دکھایا گیا اور اس کا انگریزی ترجمہ حال ہی میں لندن سے شائع ہوا ہے۔

الطاف فاطمہ جدید اردو ادب کا ممتاز نام ہیں۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو کر پڑھنے والوں میں مقبول ہو چکے ہیں۔ لیکن ادھر کچھ عرصے سے دستیاب نہیں تھے۔ الطاف فاطمہ کے دل کش اور دل نشین افسانے "شہرزاد" کے زیر اہتمام نئے سرے سے شائع ہو رہے ہیں۔

ISBN # 969 8636 34 X
Price : Rs. 140/-

شہرزاد
SCHEHERZADE

یوں کہ سڑک پر دوڑنے والی کوئی کار، کوئی ویگن، کوئی رکشہ اور کوئی سائیکل پانی سے نہائے بغیر نہ گزرا۔ پانی اچھالنے والوں میں (میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں نے بچشمِ خود یہ نظارہ کیا کہ) نوجوان بھی تھے، بچے بھی شامل تھے اور ساتھ میں اچھے خاصے معمّر اور نئے نئے معزز بننے والے مرد شامل تھے۔ سب خوب ہنس رہے تھے۔ ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر ہلا رہے تھے۔ امدادِ باہمی کے طور پر ایک دوسرے کو بالٹیاں بھر بھر کر پکڑا رہے تھے۔ کہ پانی اچھالنے کا تسلسل ٹوٹ نہ جائے۔

اور میں تھی کہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ننگے بدنوں، بھیگے کپڑوں والے انبوہ کو دیکھتی جو ایک جشن کی تقریب میں مصروف تھا۔ بڑی معصومیت اور یگانگت سے، فریجوں، صوفوں، قالینوں، کولروں اور وی سی آر کی دنیا سے نکل کروہ جیسے اپنے عالمِ آب وگل کو لوٹ آئے ہوں۔

میں بھی خوش تھی۔ خوب ہنس رہی تھی۔ مگر اس خوف کے ساتھ کہ یہ شام گزر جائے گی۔ رات میں ڈھل جائے گی۔ پھر نو بجیں گے، پھر دس کے ہندسے کی طرف تیزی سے گھڑی کی سوئیاں لپکیں گی۔ اور یہ سب کے سب اپنے قالینوں، صوفوں، فریجوں، ٹی وی اور وی سی آر کی دنیا میں لوٹ جائیں گے۔ زندگی کا یہ میوریئل پانی کی اس پھوار میں ڈھل جائے گا، حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا۔ اور پھر یہ عالمِ آب و گل، سونا اور ویران رہ جائے گا۔ نئے ٹربائن کے پھر کبھی پھٹ جانے کے انتظار میں...!

ننگی مرغیاں

''انھیں کپڑے پہنا دو۔''

میرا دل بار بار صدا دیتا ہے۔ لیکن میری کوئی نہیں سنتا۔ لوگ میری بات اس لیے نہیں سن سکتے کہ انہیں باتیں کرنے کا بہت شوق ہے۔ کچ۔ کچ۔ کچ وہ باتیں کیے جا رہے ہیں۔ ملی جلی آوازوں میں دنیا زمانے کی باتیں کیے چلے جا رہے ہیں۔ مثلاً ایک زلف بریدہ انٹلکچوئل خاتون تقریری مقابلے کے انداز میں دھواں دھار فرما رہی ہے کہ

''آج پاکستانی عورت گھر کی چار دیواری سے اس لیے نکل آئی ہے کہ اسے معیارِ زندگی برقرار رکھنا ہے۔ گھر کی آمدن اور خرچ میں توازن قائم رکھنا ہے۔ آج کی پاکستانی خاتون کے کاندھے پر دُہری صلیب دھری ہے، وہ کما بھی رہی ہے اور خاتونِ خانہ کے فرائض بھی انجام دے رہی ہے۔

ایک دوسری آواز اس تقریر کرنے والی کو مخاطب کر رہی ہے۔ جس کی کلائی میں آدھ سیر وزن کے سونے کی چوڑیاں دمک رہی ہیں۔ ''تو نے آج پھر چوڑیوں کا سیٹ بدل لیا ہے اور یہ چوڑیاں تو پچھلے سیٹوں کی چوڑیوں سے کہیں زیادہ چوڑی اور موٹی ہیں۔'' وہ شرما گئی ہے۔

Jab diwarain girya karti hain

(Short stories)

Altaf Fatima

اشاعت ۲۰۰۳ء

کمپوزنگ :لیزر پلس، کراچی

طباعت :دی سمیع سنز پرنٹرز، کراچی

شہرزاد

SCHEHERZADE

بی۔ ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔

info@scheherzade.com

''تجھے کیا دکھ ہے، میرا میاں لا کر دیتا ہے۔'' مگر چوڑیوں کا یہ چوتھا نیا سیٹ ہے۔ آواز میں رشک کا جھلساؤ ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تیرا میاں...

مگر ان کو کپڑے... کپڑے کون پہنائے گا۔

میری آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن گئی ہے۔ زبان سے نکلتے ہوئے سارے الفاظ کٹ کٹ کر بکھر گئے ہیں۔ جملے کا تار و پود بکھر چکا اور اب بولنے سے زیادہ لباسوں کے کپڑوں کی قیمتیں سننا زیادہ مناسب ہے۔ سرسبز لان پر گلِ انار کی کھلتی ہوئی کلیوں سے لدے انار کے درخت سے ذرا پرے، پیلی پیلی قندیلوں جیسے گچھوں سے سجے املتاس کے سائے میں ہم ایزی چیئرز پر بیٹھے ہیں۔ ہمارے آگے شامی کبابوں، سموسوں اور چپس سے لدی پھندی ٹرے میں چائے کی پیالیاں دھری ہیں۔ یہ چیزیں ہم برس ہا برس سے بلاناغہ کھاتے کھاتے اُکتا کیوں نہیں گئے، میں حیران ہوں۔

بادلوں سے کجلائے آسمان تلے چائے کی پیالیوں سے اٹھتی اٹھتی گرم گرم بھاپ ایک خوشنما اور خوش رنگ منظر کی تکمیل کر رہی ہے۔

مگر وہ، وہ جو ننگی۔

ایک آواز اپنے لباس کی قیمت ایک سو بیس روپیہ فی گز کے حساب سے بتانے لگی ہے۔ اور یہ اس کا روز مرہ کا لباس ہے۔ کئی آوازیں کمال ہے، حد ہے، کی صدا کے ساتھ کپڑے کی اعلیٰ کوالٹی، نفیس پرنٹ وغیرہ کی تعریف میں رطب اللسان ہو رہی ہیں۔ اس لیے ادھورے فقرے کا تار و پود پھر بکھر گیا ہے اور الفاظ شارٹ بریک کے والوں کی طرح رشتے سے نکل نکل کر پاتال میں گر رہے ہیں۔

اور ان کو resuming کے ساتھ یوں نہیں جوڑا جا سکتا کہ ایک صدا اب اس دکان کا پتا دریافت کر رہی ہے جہاں ایک سو بیس روپے اور ایک سو پچاس روپے فی گز ہی کے حساب سے کپڑا ملتا ہے۔ اور کئی آوازیں بیک وقت اور بیک زبان اس دکان بلکہ ان تمام دکانوں کا پتا نوٹ کروا رہی ہیں۔ یعنی کہ اس کارِ خیر میں کئی درد مشترک ہیں کہ پاکستان کی عورت ہر صبح گھر کو اللہ کی راہ پر چھوڑ کر بسوں، رکشوں، گاڑیوں میں

بیٹھ کر آمدن اور خرچ میں توازن قائم رکھنے کی خاطر منھ اندھیرے نکل پڑتی ہے اور اب یہ اس کا مقدر ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ باوقار پیرہن میں ملبوس رہے اور ہم نے کئی ایسی بستیوں کو... وغیرہ وغیرہ تاکہ تم دیکھو اور عبرت پکڑو۔ اے آنکھوں والو! اور میں کتنی دیر سے یہ سوچ رہی ہوں کہ کیا مجھ سے بہتر... ہاں مجھ سے کہ میں اتنی دیر سے کچھ کہنا چاہ رہی ہوں اور میرے منھ سے نکلنے والے ہر فقرے کا تار و پود بکھرتا ہے۔ ہر شارٹ بریک کے ساتھ موتی کی لڑی ٹوٹتی ہے اور موتی سرک سرک کر پاتال کو جاتے ہیں۔

تو گویا مجھ سے بہتر وہ نہیں جو چپ چاپ اپنے ویران کمرے کی دہلیز پر کھڑی ہم سب کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی اور کبھی نہیں بولتی ہے اور جس کے بارے میں ہم اندازے لگاتے ہیں کہ وہ ہر جگہ پر سے سرک رہی ہے۔ کھسک رہی ہے وہ آف سائڈ آف دی اسٹمپ ہو چکی ہے۔

اور ہم سب اپنے اپنے دل میں خوش، مطمئن اور مغرور ہیں کہ ہم اپنی جگہ پر قائم ہیں جب کہ وہ پھسل رہی ہے، پھسلی جائے گی... اور بالکل پھسل جائے گی۔ ہم سب اسی طرح مطمئن اور مغرور ہیں جیسے ہم کسی گزر جانے والے کے قل پڑھتے وقت ہوتے ہیں۔ کہ ہم موجود ہیں اور ہمارے ہاتھ دانوں اور گٹھلیوں پر مضبوط ہیں اور ہمارے جسم فی الحال لٹھے کے سفید کفن میں ملفوف ہونے کے بجائے ایک سو بیس سے ایک سو پچاس اور ایک سو اسی روپیہ گز کے کپڑوں میں ملبوس ہیں۔ اور ابھی لوبان اور اگر بتیوں کے ان خوشبودار دھوؤں کے مرغولوں کے محیط سے نکل کر ہم اپنی گاڑیوں کا رخ اس بازار کی طرف پھیر دیں گے جہاں خوب رو، تنومند جوان اور ادھیڑ عمر بزاز کہ دورِ قدیم میں اس انداز کے پارچہ فروشوں کو بزاز ہی کا نام دیا جاتا تھا اور وہ علاقہ جہاں صرف پارچہ جات ہی فروخت کیے جاتے تھے، بزازے کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مگر صدمہ تو یہی ہے کہ اس مارکیٹ کی نوعیت وہ نہ تھی کہ اس کو بزازا کہا جائے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ بزاز خوش رنگ، ترچھی پگڑیاں سروں پر سجائے اور ان کے شملے کندھوں پر ڈالے کپڑے کے نرم نرم ریشمیں سلسلاتے تھان ہمارے قدموں میں بچھا بچھا دیں گے۔

ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے۔

ہلالی وضع کے طرز پر بنی مارکیٹ کی دکانیں دیکھتے چلے جانے کے بعد سوچ میں پڑ جاتی ہوں... کیا بات ہے... کیا اسرار ہے۔ پر بھید بھید ہی ہوتا ہے اسے کھول ہی کون سکتا ہے۔ میرے ذہن میں گئے دنوں کی بازگشت ہے۔ مسلسل برستی پھوار تلے بھیگی بھیگی کیچڑ سے آلودہ سڑک پر چلتی ہوئی اس شام کے اندھیرے میں ہلالی وضع کی مارکیٹ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگا رہی ہوں۔ میرے ساتھ چھوٹو بھی بھیگ رہا ہے۔ اس کی مٹھی میں مضبوطی سے پکڑے ہوئے تین قلم ہیں جن کی نبیں وہ بدلوانا چاہ رہا ہے۔ اس کا منھ فق ہو رہا ہے، چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی ہیں۔ صبح میرا امتحان ہے۔ اور مجھے ایک امتحانی گتہ بھی چاہیے۔ ''عجیب ہی لوگ رہتے ہوں گے یہاں۔'' کیوں؟

اس لیے کہ اس بازار میں صرف جوتے اور کپڑے اور عورتوں کے میک اپ کا سامان ہے۔ پھر بندہ قلم کی نب کہاں سے بدلوائے۔ اور امتحانی گتہ کہاں سے خریدے یہاں کے لوگوں کو اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی؟ صرف!... وہ اپنے قلموں کو تأسف سے دیکھ رہا ہے۔ اب تو اتنی رات آ گئی ہے۔

میں اس وقت کے گزر جانے پر تأسف کر رہی ہوں جب نرکل اور کلک کے قلم چلتے تھے اور نب بدلوانے کی خاطر بازاروں میں مارے پھرنے کے بجائے چپ چاپ قلمدان سے قلم تراش نکال کر زبانِ خامہ تراش لی جاتی تھی۔ بندہ اطمینان سے لکھتا اور صریرِ خامہ سے لطف اندوز ہوتا تھا اور ہماری عمر تو نبیں بدلواتے اور نبوں والے قلم کھولتے ہی گزری۔ وہ پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھ رہا ہے اور کسی اسٹیشنری کی دکان کو تلاش کر رہا ہے۔

اور میں، میں چاہتی ہوں کہ اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دوں تاکہ وہ اور اس کی معصوم نظر عریانی کے اس بے حجاب منظر کو نہ دیکھ سکے۔

کیوں؟

اس لیے کہ آپ خود ہی سوچیں اس سرے سے اس سرے تک پوری مارکیٹ کے تمام دروں میں برہنہ لاشیں اپنی لمبی کی ہوئی گردنوں سے ٹنگی ہوں۔ اور نیچے آگ کے الاؤ روشن ہوں اور ننگی لاشوں کی چربی آگ کی حدت و تمازت سے پگھل پگھل کر ساری فضا کو چراہندہ کر رہی ہے۔

اے ستار العیوب! ان کی ستر پوشی کون کرے گا۔ جب کہ ہر در میں ٹنگی ہوئی برہنہ لاشوں کے عین مقابل دکانوں میں قیمتی ریشمی نرم اور سلسلاتے تھانوں کے تھان پٹے پڑے ہیں۔ یہاں اور چیزیں کیوں نہیں بکتیں؟ وہ اعتراض کر رہا ہے۔ کیوں تم کیا چاہتے ہو؟ یہاں پر کیا بکے... کیا تمہارا خیال ہے کہ یہاں مگ فورٹین اور ایف سکسٹین کی دکانیں ہوتیں۔ میں زچ ہو کر بول رہی ہوں اس لیے کہ پھوار میں تیزی اور کٹیلا پن بڑھ گیا ہے۔ اور اسٹینڈ پر کوئی رکشہ نہیں نظر آرہا ہے۔ ہوں بھی تو کیا حرج ہے۔ وہ میرے زچ ہونے کا نوٹس لیے بغیر کہہ رہا ہے اور حسرت سے ان قلموں کو بھینچ رہا ہے جن کی نبیں لکھ ہی نہیں سکتیں۔

برستی پھوار کا ترشح اور کٹیلا پن بڑھ گیا ہے۔ میں اندر برآمدے میں داخل ہونا نہیں چاہتی کہ مجھ سے برہنہ عورتوں... ! توبہ مرغیوں کا ننگ برداشت نہیں ہوتا۔

مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے یہ ننگی عورتیں... توبہ... ننگی مرغیاں قیمتی پارچہ جات کے مقابل اس لیے ٹانگی گئی ہیں کہ ان کو چڑایا جائے اور کہا جائے کہ اگر تم اپنی اور اپنے خصموں کی گاڑھی اور رشوت کی پتلی کمائیاں خرچ کر کے یہ ریشمیں سلسلاتے نرم کپڑے نہیں خریدو گی تو تمہاری زندہ لاشوں کو اس طرح برہنہ، صلیب پر ٹنگنا پڑے گا اور نیچے نارِجہنم کی دہکتے انگارے جن کی حدت سے تمہاری چربیاں پگھل پگھل کر فضا کو چراہندہ کرتی جائیں گی، کرتی جائیں گی۔

میں اس وقت یہ سب بڑی شدت سے سوچ رہی تھی۔

لیکن یہاں ہری بھری لان پر انار کلیوں سے لدے انار کے درخت سے ذرا پرے ہٹ کر بچھی ہوئی ایزی چیئرز کے حلقے میں بیٹھ کر اس کے متعلق ایک حرف بھی

سوچنا اور یاد کرنا نہیں چاہتی۔ مبادا سوچ، حرف اور پھر لفظ بن جائے اور لفظوں کی کلموں کی تراوش شروع ہو جائے۔

میں اب صرف اپنے سر پر سایہ افگن اونچے اور ہرے بھرے املتاس کو تک رہی ہوں۔ جس میں نازک پتیوں سے بنی پیلی قندیلیں ہمارے سروں تک جھک آئی ہیں، سب بول رہے ہیں۔ اور میں خاموش خاموش ہوں۔ اس لیے کہ وہ سب بولنے والی باتیں بول رہے رہیں۔

اور میں... میں صرف اس کو تک رہی ہوں جو اپنے کمرے کے دروازے کے فریم میں تصویر کی طرح جڑی کھڑی ہے۔ اور ہماری طرف حیرت سے تک رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں اتھاہ تنہائی اور اجنبیت ہے۔ یہ اب ہم سے نہیں ہے اس کا Domicile بدل چکا ہے۔ اس نے اور ہی بستی بسائی ہے۔ کوئی اس کے لیے خبط کی بات سنا رہا ہے۔

یہ اب ہاتھوں سے پرس لے لیتی ہے اور کھول کر نوٹ گننا شروع کر دیتی ہے، پھر چینج مانگنا شروع کر دیتی ہے۔ جلدی جلدی پوچھتی ہے، change ہے۔ تمہارے پاس change ہے، change ہے۔

''کہیں ایسا تو نہیں ہے یہ change یعنی تبدیلی چاہتی ہو۔''

مگر میں بات منہ سے نکالنے سے پہلے ہی اپنے منھ پر ہاتھ رکھ لیتی ہوں۔ مبادا لوگ یہ خیال نہ کریں کہ میں بھی... میں بھی...

میں ایسی باتیں کبھی نہیں کروں گی۔ البتہ میں اس وقت بھی اور اس وقت بھی اس آواز کو یاد کر رہی تھی جو اکثر رات کو پچھلے پہر سنائی دیتی ہے۔ سچ کتنی بھیانک اور کرب میں ڈوبی ہوئی ہے وہ آواز... وہ پکار پکار کر جیسے بستی کو خبردار کرتی ہو۔ اف خدایا! رات کے پچھلے پہر کٹیلی اور برفانی سردی میں، برستی بارش میں جب وہ آواز سنتی ہوں تو اپنے لحاف میں دبکی دبکی کانپنے لگتی ہوں۔ میرا کلیجہ کانپ جاتا ہے۔

اس دن ننگی مرغیوں کے وجود سے پگھلتی چربی کی چراہندہ اور ان کے مقابل

سجی ہوئی پارچہ جات کی دکانوں اور چلتے کیسٹوں کی کان پھوڑ آوازوں کے درمیان کھڑے ہو کر میں نے اس آواز کا انتظار کیا تھا کہ وہ اگر یہاں سنائی دے جائے تو میں اس سے درخواست کروں کہ یہاں پر کھڑے ہو کر اپنی اسی مہیب اور کرب آلود آواز میں ننگی مرغیوں سے خطاب کرے۔ مگر وہ آواز تو پچھلے پہر آتی ہے جب سارا عالم سوتا ہے۔ اس کے ٹرانے سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اور میں لحاف تلے لرزنے لگتی ہوں۔

میں نے اس کو دیکھا بھی نہیں تو پاؤں گی کہاں؟

ارادہ کرتی ہوں کہ اسی سے کہوں کہ چلو تم ایک لیکچر دے ڈالو۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ بولے گی ہی نہیں۔ میں نے اس وقت وہاں کھڑے ہو کر اس کو بھی یاد کیا تھا۔ اس وقت جب کہ ایک نوجوان لڑکی اپنی ماں کی بانہہ کھینچ کھینچ کر بڑی التجا سے سامنے پھیلے ہوئے رنگوں کی قوسِ قزح کی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ چہرے پر ایک قسم کی جھینپ تھی جس میں کرب کی آمیزش نے اس کے بھولے بھولے چہرے کو دھواں دھواں کیا ہوا تھا۔ میں نے پہلی بار اس پر نظر ڈالی تو مجھے شک ہوا، شاید یہ تاثر ننگے بدن ٹنگی ہوئی ان لاشوں نے قائم کیا ہے جو دروں میں سجے ہوئے آتش کدوں کے ساتھ ساتھ قطار در قطار ٹنگی ہوئی تھیں۔ اور ان میں سے کچھ سیخ پر چڑھی ہوئی تھیں۔ اور ان کی چربی شعلوں کی حدت و تمازت سے پگھل پگھل کر فضا میں چراہند پھیلا رہی تھی۔

پیراہن پوش موٹی موٹی مرغیاں قوں قوں... کرتی دکانوں میں آ رہی تھیں جا رہی تھیں۔ قوں قوں... جو ٹیلرز کی دکان میں انگوٹھیوں کو انگلیوں میں پھنساتی اور پھر اتارتی ہوئی۔ میں نے دوبارہ لڑکی کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس مرتبہ تاثر واضح تھا۔ یہ وہ تاثر نہ تھا جو زمانے کی برہنگی پر نظر پڑنے سے پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ وہ جھینپ تھی جس کو نفسیات والوں نے احساسِ کمتری کا نام دیا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ زمانے کی برہنگی کو دیکھ کر شرمانا لاحصل ہے۔ اصل بات تو ذات کی برہنگی پر جھینپنا ہے اور وہ خود اپنی ذات پر جھینپ رہی تھی کہ انسان کی برہنگی اس پیراہن سے بہتر ہے جو گھٹیا سودیشی کپڑوں

سے تیار کیا گیا ہو۔ آج کا تو درزی بھی ایسے پارچے کو ہاتھ لگاتا ہے تو سو بار دھونے کے بعد بھی اپنے ہاتھ کو ناپاک ہی تصور کرتا ہے جیسے وہ غلاظت اس کی انگلی سے لپٹ کر رہ گئی ہو۔

اے دلِ نادان... بے وجہ اس فقرے کی بازگشت، تکرار اور اعادہ میرے اندر وجود میں آیا ہے اور اب میں حیران ہوں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ ابھی تو مجھے ماں کے چہرے کے تاثرات سے دوچار ہونا ہے۔

اور ماں خجل ہے پریشان ہے۔ شرمندہ ہے۔ دراصل اس کی حیثیت ایسی نہیں کہ اس کو اس بازار میں آنے کا اذن دیا جائے۔ کیا تم کو تو خبر نہیں لوگ اب بک اسٹال رکھنے میں دلچسپی نہیں رکھتے کہ کتاب مہنگی ہے اور پیراہن پوش مرغی کتاب کی دکان میں داخل ہونا حماقت سمجھتی ہے۔ حماقت ہی تو ہوئی نا۔ پیسے اور وقت دونوں ہی کا زیاں کرنا حماقت ہی تو ہے۔ گھاٹے کا سودا۔

لیکن میں اس سے یہ سوال نہیں کر سکتی جب کہ میں اس کو جانتے ہوئے بھی اس سے یہ پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکی کہ تم لوگوں کے پرس لے کر اس میں کیا تلاش کرتی ہو، چینج کیوں مانگتی ہو، چینج سے تمہاری کیا مراد ہے۔ تبدیلی یا پیسہ؟

دیکھو لوگو! ہم کتنے بزدل ہوتے ہیں۔ ہم ایک سوال بھی نہیں کر سکتے۔ اندھیری سرد رات کے سناٹے میں ننگی اور ویران سڑکوں پر اس کی آواز گونج رہی ہے۔ اور میں اپنے نرم گرم لحاف کے اندر دبکی ہوئی لرز رہی ہوں۔ بعض باتوں، بعض آوازوں اور بعض خاموشیوں میں کتنی ہیبت ہوتی ہے۔

مگر نہیں میں تو اس ہلالی وضع کی مارکیٹ میں کھڑی ہوں جس کے ایک در کے ستون کی آڑ میں کھڑی وہ لڑکی ملتجی نگاہوں سے اپنی ماں کو خوبصورت اور قیمتی تھانوں سے معمور دکانوں کے اندر جانے کی ترغیب دے رہی ہے۔ اس کی ماں کی آنکھیں خالی ہوتی جا رہی ہیں۔ ان میں اب کچھ نہیں نظر آ رہا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے کہ وہ بھی اپنا Domicile بدل لے گی اور میں اس مارکیٹ کے در کے بجائے، پیلی پیلی قندیلوں

والے املتاس کی گہری سبز اور گھنیری چھاؤں تلے ایزی چیئر پر بے فکری سے بیٹھی ہوں۔ ہمارے سامنے سموسوں اور کریم رولز سے لدی لوئی ٹرے سجی ہے اور پیالیوں سے چائے کی گرم گرم بھاپیں اٹھ اٹھ کر فضا میں تحلیل ہو رہی ہیں۔ کمزور جذبوں اور بودی تمناؤں کی طرح۔ اور اب مجھے خوف ہے کہ ماں لپکتی ہوئی آکر میرے ہاتھ سے پرس چھین لے گی۔ اسے کھولے گی بند کرے گی۔ چیک ہے؟ چیک ہے؟

میں چپکے چپکے دل میں دعا کر رہی ہوں کہ یہ ایسا نہ کرے آج ہی تو وہ پھسلتی پھسلتی ہمارے درمیان سے نکل کر وقت کے پانیوں کے گہرے بھنور میں جا گری ہے۔ تین نوجوان لڑکے شاید یوں ہی مٹر گشتی کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک حیرت سے چاروں طرف دیکھتا ہے۔

تعجب ہے یہاں اور کچھ نہیں بکتا۔ وہ شاید خود کلامی کرتا ہے۔ یہ لڑکا بہت توانا اور بھولی بھولی شکل والا ہے۔

مگر دوسرا جو بے حد قیمتی لباس میں ملبوس اور طرحدار ہے، اپنے گلے میں پھنسی ہوئی ٹائی کو ڈھیلا کرتے ہوئے ایک واضح جواب دیتا ہے۔

نہیں یار، یہاں کیا نہیں ملتا۔ سب کچھ مل جاتا ہے۔ وہ حیرت سے کبھی ٹیلرز کی دکانوں اور کبھی پارچہ فروشوں کی دکانوں کی طرف دیکھتی ہوئی لڑکی کی جانب دیکھ کر آنکھ مارتا ہے، لڑکی مسکرا دیتی ہے۔ جواباً سیدھی آنکھ کے گوشے کو دبا کر گھوم جاتی ہے۔

ماں اور بھی زیادہ نروس ہونے لگی ہے اور وہ اپنا بٹوہ تیزی سے کھول رہی ہے اور بند کر رہی ہے۔ دیکھو! تم اپنا بٹوہ لو اور کسی سے نہ پوچھنا کہ چیک ہے؟ میرا جی چاہ رہا ہے کہ آگے بڑھ کر اس سے کہوں مگر میں جانتی ہوں کہ میں کچھ نہ کہہ سکوں گی۔ میں تو اس سے بھی کچھ نہ کہہ سکی تھی۔ جب وہ آخری مرتبہ چارج دینے لائی گئی تھی۔ ہم سب اسی طرح املتاس کے پیلی قندیلوں سے مزین گھنے پیڑ کے سائے میں اپنی ایزی چیئرز پر اس طرح جکڑے بیٹھے تھے جیسے کسی نے ہمیں میخوں سے گاڑ دیا ہو۔ ہم سب اس کے چہرے کے اس کرب کو اس طرح دیکھتے رہے جیسے ٹیلی ویژن کی اسکرین پر کوئی المیہ ڈرامہ ہو رہا ہو۔ اور ہم اس کو محویت سے انجوائے کر رہے ہوں۔ وہ لمحہ جو چارج دینے

سے متعلق تھا اس پر کیسا گزرا، اس کا ابلاغ کیسے ہوتا، جب کہ مکالمہ ساقط تھا اور ہم ابھی ایکشن (Action) کی تفہیم کا حوصلہ اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے اس لیے کہ ہم مصروف ہیں۔ جدید عہد کی جدید مصروف خواتین، تاہم اس کے بعد ہم نے اس کو پوری قوت سے گیٹ کی طرف یوں دوڑتے دیکھا جیسے بندوق سے گولی نکل کر اپنے ہدف کی طرف لپکتی ہے۔ گیٹ کا چھوٹا دروازہ اگرچہ کھلا تھا لیکن اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چیر کر بڑے در کو وا کیا اور صحرا کی بادِ سموم کی طرح نکل گئی تھی۔

اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ایسے صحرا میں کھڑی ہوں جہاں سناٹا ہے، تھور کے درخت ہیں، ننگی مرغیاں ہیں اور ان کے اندر سے پگھلتی ہوئی چربی کی چراہند ہے جو اپنے ہی محور پر یوں رک گئی ہے کہ یہاں اب ہواؤں کے قدم تھم چکے ہیں۔

بارش کی چھم چھما چھم کی آواز میں تیزی آ گئی ہے۔

اے لوگو! سنو، جب تم بے لباسوں کو لبادے اوڑھنے پر آمادہ نہ کر سکو تو اپنی نگاہیں نیچی کر لو۔ لحاف کی نرمی اور گرمی تلے لرزتے ہوئے سنی ہوئی یہ صدا اس وقت یہاں صاف سنائی دے رہی ہے۔ سامنے والی لڑکی کے تن سے دھیرے دھیرے وہ لباس سرک رہا ہے جس پر وہ شرمسار تھی۔ ننگی اور لمبی گردنوں والی برہنہ لاشیں ہی لاشیں، میں نے گھبرا کر نظر نیچی کر لی اور سڑک کی طرف دیکھا۔ ایک رکشہ دھڑ دھڑ کرتے، دھیما ہوتے ہوئے مجھے مخاطب کر رہا تھا۔ میں ایک ہی جست میں رکشے کے اندر تھی دوسرے لمحے میں نے محسوس کیا، چھوٹو کے چہرے کے ملال میں اضافہ ہو گیا اور وہ بغیر نبوں والے قلموں کو بڑے قلق سے اپنی مٹھی میں بھینچ رہا تھا۔ فکر نہ کرو بیٹا میں تم کو اپنا قلم دے دوں گی۔

رکشے کے گھپ اندھیرے میں میں صاف طور پر دیکھ سکتی تھی کہ یہ سنتے ہی اس کی لمبی لمبی خوبصورت آنکھوں میں جگنو سے جھمک اٹھے تھے۔

چرواہا

اک ذرا سی بات ہوتی ہے۔
اور کیا سے کیا نہیں ہو جاتا۔

اصل میں ہوا یہ تھا کہ آنکھ جلدی کھل جانے کی وجہ سے نورِ سحر کے تڑکے سے بھی کچھ پہلے شانتی (بعمر سات سال) اور کیانتی اپنی کوٹھریا سے نکل کر باغ میں پہنچ لیں۔ آسمان بھی نند سا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی تھی۔ ہارسنگھار کے پیڑ تلے فصل کے جھڑنے سے پھولوں کی ننھی ننھی ڈھیریاں سی بن گئیں تھیں۔ سفید زعفرانی ڈنڈیوں والے پھولوں کی خوشبو سے سارا باغ مہکا ہوا تھا۔

نہ جانے شانتی کے جی میں کیا آئی۔ بھاگ کر واپس اپنی کوٹھریا میں گئی اور ارہر کی باریک باریک تیلیوں سے بنی ہوئی ننھی سی ٹوکری لائی۔ کیانتی بولی۔

کیوں ؟ کیوں! میں بھی لاؤں گی اپنی ٹوکری۔

وہ بھاگ کر گئی اور اپنی ٹوکری اٹھا لائی۔

دونوں نے ٹوکریاں پھولوں سے بھر لیں تو انھیں جی بھر کر دیکھا۔

صبح صادق کا وقت ہوتا ہی عبادت اور پوجا پاٹ کا ہے۔ مندر کی اور منھ اٹھا

انتساب

شامی

حریت کے متوالے فلسطینی لڑکے کے نام

وہ جہاں کہیں بھی ہو خدا اُس کی حفاظت کرے

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

کر نکلی چلی گئیں۔ راستے میں وڈیا کی دکان پڑی۔

وڈیا صبح ہی صبح دکان کھول لیتا تھا۔ طرح طرح کا پرشاد اور رنگ رنگ کے چڑھاؤں کا سامان دکان پر سجا ہوتا۔ شانتی ایک لمحے کو رُکی۔ للچائی نظروں سے اجلے اجلے بتاشوں کو دیکھا پھر اپنے ننھے سے لہنگے کا نیفہ ٹٹولا۔ ایک چونی اس کے بل سے نکالی۔

کیانتی فوراً بولی۔

شانتی! شانتی! لا اس میں دوّنی میری ہے۔

کیوں! کیوں، شانتی نے اپنی آنکھیں بھینگی کر لیں (غصہ آتا تو وہ یہی کچھ کر لیتی) کوئی نہیں دینا۔

کیانتی نے ایک دم بھٹنیوں کی سی آواز نکالی۔

''کیوں! کیوں! ماں نے جو کہا تھا اس میں دوّنی تیری ہے۔''

پھر ایک دم بھبک کر بولی۔

کیسے نہیں کہتی ہمارا مجادی۔ دے نا میری دونی۔ اورسے ہوتا تو شانتی اس کے ننھے ننھے جھونٹے پکڑ کر دو لگاتی۔ مگر یہ اور ہی سے تھا۔ عبادت اور تقدس کا۔ چاروں اور پنچھیوں نے چہکار مچا رکھی تھی۔ ملا بانگ دے رہا تھا۔ کہیں کہیں سے مندروں میں گھنٹیوں کی آواز بھی آتی تھی۔

ہاتھوں میں پوجا کے پھولوں کی ٹوکریاں تھیں۔ مجبور ہو کر حامی بھر لی۔

وڈیا سے شانتی نے آنے کے بتاشے خریدے، آنے کا سیندور اور بڑی حقارت سے دوّنی کیانتی کے قدموں میں ڈال دی۔

''شانتی !شانتی میں کیا خریدوں؟'' اس کی آواز ابھی تک نندا سی تھی۔

''اوں بول نا۔'' اس نے ٹہوکا دیا۔

''تو آنے کی کھیلیں، آنے کے بتاشے لے لے۔''

شانتی کا منھ دوّنی کے زیاں پر ابھی تک پھولا ہوا تھا۔

کیانتی نے شانتی کی پوری بات کب مانی تھی۔ اس نے آنے کی کھیلیں لیں اور آنے کا منّت کا لال سبز کلاوہ۔ شانتی وہیں دکان کے تھڑے پر اکڑوں بیٹھ گئی لرزتے ہاتھوں سے سیندور کی پڑیا کھولی۔ پھر سرگوشی میں بولی۔

''کیانتی! کیانتی، یہ سیندور کا ٹیکہ میرے متھے کے عین بیچوں بیچ لگا دے۔''

''میں بھی لگواؤں گی۔'' وہ منمنائی۔

لگوا لینا! پہلے تو میرے لگا پھر میں تیرے لگادوں گی۔

لال لال سیندور کے ٹیکے لگائے پوجا کے لیے بالکل تیار، اب دونوں مٹکتی لہنگے بھڑکاتی مندر کی سیڑھیوں پر ٹھٹکی کھڑی تھیں۔ پہلے تو چل نا۔ شانتی نے کیانتی کو ٹھوکا۔

''کیوں کیوں! تو چل پہلے تو بڑی ہے۔'' کیانتی بالکل سکڑ کر شانتی کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔

شانتی اڑ گئی... اڑ کیا گئی تھی اس کی ٹانگیں لرزتی تھیں۔

کیانتی نے پیٹھ پر ہاتھ جما کر ایک ذرا یوں ہی سا دھکا دیا تو شانتی غڑاپ سے مندر کے اندر۔ ساتھ ہی کیانتی بھی داخل ہوگئی۔

اور جو پھول گر جاتے تو۔

شانتی نے کیانتی کو گھورا۔

مگر یہ لڑنے بھڑنے کا موقع نہ تھا۔ سامنے بھگوانؑ کی مورتی زبردست پوز مارے، آسن جمائے استھان پر براجمان تھی۔

اب تو ان کا ہیاؤ ٹوٹ ہی چکا تھا۔

دونوں نے بڑی ماہر پجارنوں کی طرح زمین پر گھٹنے ٹیک کر بھگوان کو پرنام کیے۔ لرزتے ہاتھوں سے پڑیا کھول کر سیندور کے ٹیکے لگائے۔ پھول چڑھائے۔ آخر میں پرشاد چڑھایا۔ کیانتی شانتی سے سدا ایک قدم آگے چلتی تھی۔ اس وقت بھی اس پر سبقت لے جانے کے خیال میں جانے کیا ہد ہد کرکے منّت کا کلاوہ باندھا۔ پھر

باقاعدہ الٹے قدموں واپس چلیں تو پھر شانتی ایک دفعہ ہی بھاگ کر واپس بھگوان کے دوارے گئی۔ دو اجلے اجلے بتاشے مٹھی میں دبائے بھیگی بلی بنی لوٹ آئی۔

اس کو پتا بھی نہ چلا کہ کیانتی نے بڑی پکی آواز میں کہا۔

شانتی تو نے بھگوان کا پرشاد چوری کیا ہے، تجھ پر عذاب پڑے گا اور اپنا جھوٹا سیندور بھگوان کو لگانا پاپ ہے، مہا پاپ۔

اچھا! سیندور تو نے تو جوٹھا کیا نہیں جیسے۔

مگر پرشاد تو نے چرایا۔ کیانتی نے نندا سی آواز میں ڈرتے ڈرتے کہا۔ پھر ایک دم بات بدل دی۔

شانتی! شانتی، کتنا اچھا سمے ہے نہ دن نہ رات۔ سارا دن اور جیسا کیوں ہو جاتا ہے ایسا ہی کیوں نہیں رہتا۔

مرضی ہے بھگوان کی... شانتی بڑی گیان سے بولی۔

وہ ابھی مندر سے آدھے راستے آئی تھیں کہ مہاراج نے انھیں جا لیا۔ ایک ہاتھ میں گڑوی تھامے، دوسرے سے گیلا گیلا جینو کاندھے پر جمائے... رک جاؤ... کلنکنیو... ابھاگنو...

وہ تیز تیز بھاگیں۔ تھل تھل کرتے مہاراج بھی پیچھے لپکے۔ اب وہ ان کے بالکل قریب آ گئے۔ مگر وہ ان کو ہاتھ کیسے لگاتے۔ ارے کھان صاحب لینا پکڑنا جانے نہ دیو۔ ان ابھاگنوں کو، کلنکنیوں کو۔

ننھی ننھی، پھٹی پھٹی آنکھوں والی کلنکنیوں کو دیکھ کر خان صاحب ہنس پڑے۔ اری سوریو! کیا کر دیا ہے؟ خان صاحب نے سوال کیا۔

''کر دیا!... ارے کھان صاحب بیڑا غرق کر دیا۔ نشٹ بھرشٹ۔ اری ہتھیارنوں آج ہم نے صبوں صبوں (صبح صبح) کس کا منھ دیکھا تھا۔'' وہ بین کرنے لگے۔

''ارے آئینہ تو نہیں دیکھ لیا تھا مہاراج،'' خاں صاحب بولے۔

مہاراج پھر دھاڑے۔ ٹھہرو تو سالیو!

خاں صاحب نے پھر ٹھٹھا مارا۔

مہاراج ہاتھ تو لگا نہیں سکتے تم ان کو۔ اور بنا رہے ہو سالیاں۔

ارے کھان صاحب، تم کو مخول سوجھ رہی ہے۔ یہ حرامزادیاں مندر میں گھسیں۔ پوجا کی، بھگوان کو سیندور کے ٹیکے لگائے، پرشاد چڑھایا...رام رام... دیارے... مہاراج پھر تو بڑا اچھا دن چڑھا۔ بھگوان بھی خوش ہوگیا ہوگا۔ صبح صبح مندر میں فرشتوں جیسے معصوم قدم آئے۔

دراصل خاں صاحب مہاراج کو باتوں میں لگا کر ابھاگنوں کو بھاگ جانے کا موقع فراہم کر رہے تھے۔

اور وہی ہوا۔ ادھر مہاراج کے اور ان کے سوال جواب شروع ہوئے ادھر شانتی اور کیانتی دوبارہ کلکٹر صاحب والے بنگلے کے پھاٹک میں گھس گئیں۔

ان کی اماں کیسریا لہنگا پھڑکاتی ڈرائیو پر جھاڑو لگا رہی تھی۔ ان کو دیکھ کر گرجی۔

کہاں گھوم رہی تھیں لات کی جنیو۔

اب سورج کی اکا دکا کرن درختوں کی پھننگوں پر اتر رہی تھی۔

اماں! اماں، ہم پوجا کرنے گئی تھیں۔ اکسائٹ منٹ کے مارے آوازیں لرز رہی تھیں۔

ماں نے جھاڑو کے سڑاکوں میں ان کی بات پر کان نہ دھرا۔ جھڑک کر بولی۔ چلو کوٹھریا میں۔ کیانتی! پربھو بہت رو رہا ہے، اسے اٹھالے اور شانتی تو چل جھاڑو دے کوٹھریا میں، باسن صاف کر۔

اصل بات تو اس وقت کھلی جب رام چرن کو مہاراج کا بلاوا آیا۔ مہاراج نے پہلے تو رام چرن کو گالیوں پر دھر لیا۔ وہ بگڑے دل، چلبلی طبیعت، انگریز کلکٹر کا جمعدار، ذرا بھبکا تو مہاراج نرم پڑے۔

میں نے بچے کر کے چھوڑ دیا ہے مگر پرائشچت تو جرور ہی کرنا پڑے گا۔

پرائشچت۔ مہاراج نے لال لال آنکھیں نکالیں۔

اچھا تو تم لے لو پرائشچت کے پیسے۔ اور کیا میری لڑکیوں کی جان لو گے۔

وہ بھی ہو جاتا ہے۔ مہاراج نے دھیرے سے کہا۔

رام چرن بکے گیا۔ ہم گندے، ناپاک، شودر ہم کیا کریں گے۔ تم پیسہ بتاؤ اور جان چھوڑو، کرتے رہنا آپ ہی پرائشچت۔

ہاں تو پھر ایسا بولو نا۔ مہاراج پرائشچت کا حساب کتاب کرنے بیٹھ گئے۔ بات پورے ڈھائی سو پر آ کر ٹوٹی۔

رام چرن سر کھجانے لگا۔

تو مہاراج نے ڈراوا دیا جو کرنا ہے پہلے کر ڈالو۔ اور جو پنچائت بیٹھ گئی تو...

رام چرن بڑی چلبلی طبیعت اور کڑوے مزاج کا شخص تھا۔ تمام راستے بڑ بڑ کرتے آیا۔ تمام راستے بکتا آیا۔

ہوں۔ ڈھائی سو... ڈشٹ چور کہیں کے... پرائشچت... پرائشچت۔ ڈھائی سو... نشٹ بھرشٹ...

دوپہر تک کیسریا کے سارے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ اس پر لرزہ سا طاری تھا۔

تم ایسا کرو میرے گہنے رہن رکھوالو۔ جو چاندی کے ہیں۔ سو تو سہی مگر میں نے لوگوں کو کانسی اور پھول کے گہنے بھی رکھواتے دیکھا ہے۔

چپ رہ حرامزادی۔ بس ہوگیا فیصلہ۔

وہ اس وقت تاڑی پیے تھی۔ کیسریا چپ ہوگئی۔ مگر اس نے دونوں لڑکیوں کو گالیوں پر رکھ لیا۔ دھواں دھواں دہتڑ مارنے، نامرادنیں، ابھاگنیں، بڑی مندر کی پجارنیں بن کر پلی تھیں۔ ہیں نادیوداسیاں۔

شانتی نے دھیرے سر اٹھایا اور کیانتی نے تو کھرج ہی سے آغاز کیا اور پھر دونوں جو دھاڑی ہیں تو رام چرن چھلا (چری ہوئی لکڑی) لے کر اس کے سر پر

آکھڑا ہوا۔

کھبردار! جو میری چھوکریوں کو کچھ کہا ہوگا۔ ہوگیا جو ہونا تھا۔ بس اب میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے۔ ہونہہ! پرائشچت۔ پرائشچت۔ اس کی گول گول سیاہ آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اس کے گالوں پر بہنے لگے تھے۔ لڑکھڑاتے قدموں چرپائی پر جا پڑا۔

''دیکھو میں تم کو بھیجتا ہوں، گویا بھیڑوں کو بھیڑیوں کے بیچ میں۔ بس سانپوں کے مانند ہوشیار اور کبوتروں کی مانند بھولے بنو۔ مگر! آدمیوں سے خبردار رہو کیوں کہ وہ تم کو عدالتوں کے حوالے کریں گے۔ اپنے عبادت خانوں میں کوڑے ماریں گے۔ اور تم میرے سبب بادشاہ اور حاکموں کے سامنے گواہ بنا کر حاضر کیے جاؤ گے۔'' (انجیل مقدس متی ۱۶:۱۸)

(۲)

پورے بارہ برس پادری جانسن نے رام چرن کو تلقین کی اور ترغیب دی تھی مگر وہ ٹس مس نہ ہوا۔ جب کہ ہر شام وہ سب کی ہمراہی میں اپنا اسٹول اٹھائے فادر صاحب کی دلکش اور سادہ خواب گاہ میں آتا۔ بائبل اور سرمن سنتا۔ سب کے ساتھ مل کر عشائے ربانی میں شریک ہو کر اونچی اونچی آواز میں کہتا۔

''اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہی آئے تیری مرضی جیسے آسمان پر پوری ہے، زمین پر بھی پوری ہو۔''

اب اس کی اور آسمان کے بادشاہ کی مرضی کیا تھی، یہ کون جان سکتا تھا۔ خود فادر جانسن بھی نہیں۔

دعا کے بعد جب مالی، دھوبی، خانساماں اور مشن کے بیرے اپنے اپنے اسٹول اٹھائے باہر نکل جاتے تو جانسن صاحب تقریباً دس منٹ اس پر اور لگاتے۔ دھیمی دھیمی نرم اور گمبھیر آواز میں تلقین کے چند جملے۔ اور وہ ان کے شفاف سینے لٹکتی ہوئی سینے چاندی کی ننھی سی صلیب کو بغور دیکھتا۔ پھر بولتے بولتے رک کر وہ اپنی سیامی بلیوں کی سی نیلی نیلی نرم آنکھوں کو اس میں ڈالتے تو وہ جوں کی توں نظر آتیں۔ ویسی

ٹھس، اڑیل اور سلیٹ کی طرح صاف۔

پھر بھی وہ چلتے چلتے اس کے کاندھے پر تھپکی دیتے۔

ویل مائی سن رام چرن... کبھی تو... کبھی نہ کبھی تو۔

اور رام چرن اس خیال سے لرز جاتا کہ مقدس فادر صاحب نے مجھ کو چھوا۔ میرے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔ مجھ اچھوت ابھاگی کو۔ پھر خود اس کو بھی تو صاف طور یہ خبر نہ تھی کہ وہ ہر روز اتنی پابندی اور عقیدت سے فادر صاحب کے کمرے میں گیا۔ اس کو خود نہیں معلوم تھا کہ جب فادر صاحب بائبل کا کوئی باب اپنی لرزتی آواز اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں پڑھ کر سناتے اس کی جھکی جھکی نگاہیں کاہے کو کبھی سرخ حاشیے والے سیمنٹ کے فرش کبھی پادری صاحب کی خوابگاہ میں ٹنگے برف سے سفید پردے کے ساتھ لگی بہوگنی کی رائٹنگ ٹیبل پر ناچتی ہوئی ٹیبل پر دھرے پیپر ماشی کے کام والے لیمپ اور کافوری لیمپ شیڈ پر سے کھڑکی پر چڑھی ہوئی چنبیلی کی بیل میں سے چھن چھن کر آتی چاندنی میں کیوں گھس جاتی ہیں۔ پادری صاحب کی ساری باتیں سر جھکائے سرمن سنتا ہے۔ مگر اس کی نظریں اونچے سیاہا سٹول پر رکھے، پیتل کے گلدان میں سجے سفید گلابوں اور اسپراگس کی ڈالوں پر ہوتی ہیں۔ ہاں اتنی بات ضرور تھی کہ جب وہ وہاں سے نکل کر اپنی کوٹھریا کے آگے بان کی کھدری چارپائی ڈال کر بے سدھ پڑتا تو لگتا کہ وہ پادری صاحب کی خوابگاہ میں ان کے شفاف بچھونے والی مسہری پر محوِ استراحت ہے اور سفید گلابوں کی کومل مہک اس کے چاروں اور پھیلی ہے۔ اس کے جانے کے بعد فادر جانسن ایک بار پھر بائبل اٹھا کر پڑھتا۔

"کیوں کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ بہت سے نبیوں اور راست بازوں کی آرزو تھی کہ جو کچھ تم دیکھتے ہو دیکھو... مگر اور جو باتیں تم کو سنائی جاتی ہیں ان کو سنو۔ مگر نہ سنیں... پس بولنے والے کی تمثیل سنو۔ جب کوئی بادشاہی کلام کو سنتا سمجھتا نہیں، تو اس کی مثال ایک ایسی زمین کی ہے جہاں دانہ بویا گیا اور شریر

(شیطان) آ کر چن لے گیا۔''

وہ آنکھیں بند کے لیتے، اچھا ٹھیک ہے پھر۔

''تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمانوں پر پوری ہوتی ہے ویسی زمین پر بھی پوری ہو...''

(۳)

ساون کی پہلی برکھا برس کر کھلی تھی۔ بادل جھومتے تھے۔ بگلوں کی سفید ڈاریں جیسے آکاش کے نیلمی سمندر میں تیرتی تھیں۔ پادری صاحب کے برآمدے میں لگی بانسوں کی جالی پر پھیلی عشقِ پیچاں کے ننھے ننھے آتشی گلابی پھول ستاروں کی طرح دمکتے تھے۔

پادری صاحب اپنی بڑے بڑے ہتھوں والی آرام کرسی پر دراز تھے۔ بیرا ابھی ابھی موتیوں کی بنی نازک ڈالی سے ڈھکا لیمن واٹر کا جگ اور بسکٹ کی پلیٹ رکھ کر گیا تھا۔ سامنے دیوار پر لگے کلاک نے دس کا گجر بجا دیا تھا۔ اور عین اسی وقت رام چرن نے جافری کے دروازے پر ہاتھ رکھا تو جالیوں میں بندھی ننھی ننھی گھنٹیاں ساری کی ساری بج اٹھیں۔

یہ پادری صاحب کا آف ٹائم ہوتا تھا اور اس وقت ملازمین مخل نہ ہوتے تھے۔ گھنٹیاں بجتی ہی چلی گئیں۔

یس... کون ہائے۔

الکسائی سی آواز میں استفسار کیا۔

''رام چرن'' باہر سے مری مری گھٹی گھٹی آواز آئی۔

یس کم ان... پادری صاحب کی آواز تھکان سے مغلوب تھی۔

جانسن صاحب خود اٹھ کر دروازے تک آئے۔ ان کا خیال تھا کیسریا آج پھر دردِ زہ میں مبتلا ہے اور رام چرن کو ان کی مدد درکار ہے۔

سفید براق سی ڈاڑھی۔ اونچا اور چوڑا سراپا۔ برف سا سفید چوغہ اور سینے پر

لرزتی ہوئی ننھی سی صلیب۔

رام چرن کو یوں لگا جیسے بھگوان... خدا باپ اس کی پیشوائی کو خود اتر آیا ہو... اور اس پر جیسے مکھن، دودھ، ملائی اور سفید گلابوں کی برکھا سی ہوگئی ہو۔

''ہیلو رام چرن !مائی سن... کیسریا کو آج پھر... آج پھر؟''

''نو فادر صاحب نو... کیسریا کو نہیں مجھے ضرورت ہے۔''

فادر صاحب کی نیلی نیلی آنکھیں پھٹ کر کھلیں تو دیکھتے کیا ہیں کہ... رام چرن نہایا دھویا... آزو بازو دو ننھی چوہیوں کی طرح ڈری، سہمی، لرزتی، کانپتی خوفزدہ لڑکیاں (ماں نے ان کی چٹیاں غصے میں کس کس کر گوندھی تھیں کہ چوہیوں کی دُموں کی طرح ہی کھڑی تھیں) اونچے اونچے لہنگے، ننھی ننھی کرتیاں، پھٹی پھٹی کالی آنکھیں۔

فادر جانسن نے اپنی موٹی سی انگلی اٹھائی۔

''میں تم کو کھوب جانتا... یو ناٹی گرلز تم میں سے ایک شانٹی ہے۔ اور دوسری کیانٹی... کیا... باٹ ہوگیا... تمہارا ڈانٹ درد یا ٹانگ میں چوٹ لگایا۔

اگرچہ فادر جانسن بچیوں سے مذاق کر رہا تھا لیکن اس کی آواز کامیابی کی خوشی سے لرزاں اور رقصاں تھی۔

ضرور آج کسی انقلاب نے اس کے دروازے پر دستک دی تھی۔

رام چرن بے صبر ہو رہا تھا۔ مبادا اس کا نیا نویلا ارادہ چینج ہو جائے۔ وہ اپنی مخصوص چلبلی آواز میں تحکمانہ بولا۔ جلدی کر لو... تم ہمیں گرجا کرا دو... وہ مڑمڑ کر یوں دیکھتا تھا جیسے لوگ ڈنڈے لیے اس کے پیچھے آتے ہوں۔

فادر جانسن بغیر اک لفظ بولے مڑ گیا۔ خواب گاہ کی میز پر سے بائبل اٹھائی۔ دونوں لڑکیاں اور رام چرن۔ فادر صاحب جلدی میں سیڑھیاں طے کرتے مشن چرچ کے اندھیرے اور خنک ہال میں اتر گئے۔

(۴)

ہوسٹل میں قیام کے دن سے چوتھی رات چڑھی اور ڈارمیٹری کی ساری بچیاں

جشنے دارد

علاقے کا ٹربائن پھٹ گیا ہے۔

پہلے جیسے دن ہوتے تو یہ خبر آناً فاناً پھیلتی اور ہم تک آجاتی۔ تارکول کی سیاہ چکنی سڑک سے چلتی چلتی اس موڑ پر آئی جہاں کوڑے کا ڈپو کارپوریشن نے بادلِ ناخواستہ اور شرما شرمی بنا دیا تھا... مگر یہ فوراً ہی توڑ دیا گیا۔ پورے کا پورا نہیں، بس پہلے تو تین دیواریں رہنے دی گئی تھیں، صرف ایک کو توڑ دیا گیا تھا۔ اب آپ یہ نہ پوچھنے بیٹھ جائیں کیوں! کیوں توڑ دی گئیں؟ پھر تو میرے پاس ایک ہی جواب ہوگا۔

بس یوں ہی... لوگوں کی خوشی اور تاکہ بچّوں اور کتوں اور محلے میں پھرنے والے دیوانے (کہ محلے میں بے مقصد پھرتے پھرتے اس کے سر پر دھنکی ہوئی روئی کا جال سا تن گیا ہے۔ پھٹے پرانے لنڈے کے کوٹ، پتلونیں اور غلاظت میں لتھڑی ہوئی جرسیوں کے ہمراہ مری ہوئی مرغیوں (پروں سمیت) کو کھینچ کھینچ کر سڑک پر پھیلانے میں سہولت رہے)

دیکھئے پلیز! آپ مجھ سے سوال پوچھ کر میری توجہ دوسری طرف نہ کریں اور اصل نکتے پر مرکوز رہنے دیں۔ یعنی نکتہ یہ کہ اب ہمارے علاقے میں خبر سفر نہیں کرتی اور

سفید چادروں پر لگے سرخ سرخ کمبل اپنے اوپر کھینچ کر سو رہی تھیں۔ کیانتی رینگتی ٹٹولتی شانتی کے پلنگ پر آئی۔

شانتی! شانتی۔ اس نے سرگوشی کی۔ سو گئی تو؟

شانتی تکیے میں منھ دیئے آنسو بہا رہی تھی۔

اوں سو گئی یہ تو... مایوس ہو کر کیانتی واپس جانے لگی۔

نہیں تو... سو کب رہی ہوں۔ آنسوؤں سے تر گھٹی گھٹی آواز میں کیانتی نے جواب دیا۔

پھر تو اٹھ کر بیٹھ نا۔ بات کرنی ہے ضروری۔

شانتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہلکی ہلکی سسکیاں تھیں کہ اب تک نکلی جاتی تھیں۔

شانتی! تو روئی ہے نا... رونا تو مجھے بھی آ رہا ہے۔

اندھیرے میں کیانتی کی آواز بھر بھرا گئی۔

پھر وہ خود کو سنبھال کر بولی۔

شانتی۔ دیکھ نا... میں نے کیا بولا تھا تجھے۔ تو نے بھگوان کا پرشاد چوری کیا تھا۔ بھگوان نے سراپ دیا۔ یہ بھگوان ہی تو ہے۔

ہاں میں نے چوری کی تھی پر تجھے کیوں سراپ لگا۔

کیوں۔ کیسے لگ گیا، چل اب اس وقت بھاگ چلتے ہیں۔ چپ چاپ، مندر اتنی دور تو نہیں۔ پھر بھگوان سے پرارتھنا کریں کہ وہ ہمیں چھما کریں۔ اور پھر مندر سے گھر کو چلے جائیں گے۔

شانتی کیانتی کی جسارت پر حیران رہ گئی۔

دیکھ کیانتی، ششٹر صاحب نے ہم کو کیا بولا ہے؟ وہ بولتی ہے کہ بھگوان کا نام نہیں لیتے۔ خدا باپ ناراض ہوتا ہے۔

کیوں کیوں۔ خدا کو کیا پڑی ہے ناراض ہونے کی۔

کوئی اندھیرے میں کیانتی کی صورت دیکھتا تو اسے پتا چلتا۔ آنکھوں کے

سفید سفید ڈھیلے اندھیرے میں چمکتے ہوئے، بالکل گول سا چہرہ، موٹے موٹے ہونٹ، کبھی ادھر کبھی ادھر کو مڑ رہے ہیں۔ جیسے منہ چڑا رہی ہو۔

شانتی۔ میری بات مان لے۔

دیکھ کیانتی، دوسری بات ششٹر صاحب نے کہی تھی کہ تم شانتی نہیں ایلما ہو۔ اب تو بھی مجھے ایلما ہی کہہ۔

ایلما... اور... اور شانتی! ششٹر صاحب نے میرام کیا بتایا تھا۔ لو، میں تو بھول ہی گئی... اس نے اندھیرے میں ننھے ننھے ہاتھ نچائے۔

لو! تیرا تو آئیوی نام بتایا تھا انھوں نے۔

آئیوی! لو یہ بھی کوئی نام ہوگیا بھلا۔ ناجی نا یہ نام تو بالکل ہی ٹھس ہے۔ پھر وہ بولی شانتی! شانتی! اکیلے میں تو ہم یہ نہیں بولیں گے نا۔ تو مجھے کیانتی کہے گی۔ میں تجھے شانتی۔

اس کے اندر تو جیسے بغاوتوں کا لاوا پک رہا تھا۔

شانتی غریب لرز گئی اور اس نے اپنی سسکیاں روک کر اسے سمجھایا۔ دیکھ کیانتی تو ایسی ایسی باتیں نہ سوچا کر۔ اور یہ رات کو نکل جانے والی بات تو پھر کسی سے کرنا ہی نہیں۔ اسٹول پر بڈھا ولیم، پاپی کہیں کا ڈنڈا ہاتھ میں لیے بیٹھا ہے، گیٹ کو تالا لگائے۔ پکڑی جائے گی۔ یاد نہیں جب تو پہلی پہلی شام روتی ہوئی بھاگنے لگی تھی تو مدر صاحب نے کیا کہا تھا۔

کیا کہا تھا؟ کیانتی شانتی ہی کے منہ سے سب کچھ کہلوانا چاہتی تھی۔

یہی کہا تھا کہ اگر آئندہ بھاگنے کی کوشش کی تو دوسرے شہر کے دور والے مشن میں بھیج دوں گی۔

ششٹر صاحب کی ٹارچ کی چمک اور جوتے کی کھٹ کھٹ نے بتا دیا کہ راؤنڈ پر نکل پڑی ہیں۔

کیانتی بھاگ کر اپنے پلنگ پر لیٹ کر سوتی بن گئی۔

(۵)

''اور جو دانہ پتھریلی زمین میں بویا گیا یہ وہ ہے جو کلام کو سنتا ہے اور اسے فی الفور خوشی سے قبول کر لیتا ہے لیکن اپنے اندر جڑ نہیں رکھتا۔'' (متی۔ ۲۱)

اور کیسریا اپنی ہی پتھریلی زمین کا دانہ تھی۔

بارہ سال گزر گئے۔ ایلما اور آئیوی نے قد نکال لیے۔ ایلما نویں میں، آئیوی آٹھویں میں آ گئی تھی۔ وہ اب بھی مشن کے ہوسٹل میں مقیم تھیں۔ اور مہینے کی پہلی اور آخری اتوار کو گھر آتی تھیں۔ گھر اب پہلے سے کتنا مختلف تھا۔ زندگی میں تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ مگر یہی کچھ تو کیسریا پر بھاری پڑا۔

اس بوجھ بھار کے سلسلے کا آغاز اسی شب سے ہوا جس کی صبح پادری صاحب نے رام چرن اور چھوکریوں کو پہلا پہلا گرجا کرایا۔ یعنی اس شب جب تمام سننے والے (رام چرن سمیت دوسرے مالی، دھوبی اور بیرے وغیرہ) پادری صاحب کی خواب گاہ سے نکل کر اپنے کرمچ کے جوتوں کو دبا دبا کر چلتے ہوئے باہر نکل گئے تو فادر جانسن نے ایک اور ہی دعا مانگی تھی۔

اے آسمانی باپ۔

اے خدا وندِ قدوس۔

مجھے توفیق دے کہ رام چرن اور اس کے کنبے کی زندگیوں کے دکھوں کو دھیرے دھیرے آسائشوں میں بدل دوں۔ میں نے اس کا ایک مدت انتظار کیا ہے۔ پورے بارہ برس سے میں نے اس کا انتظار کیا اور وہ آیا۔

آسائشیں ہی تو کیسریا پر بھاری پڑیں۔ اول تو یہ کیسریا سے روزی بن جانے والا حساب کتاب اس کی سمجھ اور قبولیت سے باہر تھا۔ دوسری بات یہ کہ پادری صاحب کی خصوصی توجہ نے مسٹر جوزف چرن کو جو مراعات دی تھیں۔ وہ روزی سے سنبھالے نہ سنبھلتی تھیں۔ وہ کلکٹر صاحب کی کوٹھی والی کوٹھریا سے اٹھ کر مشن کمپاؤنڈ کے سرے پر لکڑی اور پتھر سے بنی ہوئی ہٹ میں مقیم تھے۔ جن میں باتھ روم، کچن اور وہ بھی

کھڑے چولھے والا جب کہ کیسریا اپنے مٹی سے بنے لیپے پوتے چولھے میں پھنکنیوں سے پھوں پھوں کر کے آگ جلانے کی عادی۔

مسٹر جوزف چرن اب مشن کے سینئر اسٹور کیپر کی حیثیت میں کام کرتے تھے۔ اب ان کو پادری صاحب کی خواب گاہ والے سرمن کے بجائے تعلیمِ بالغاں کی کلاسوں میں حاضری دینا پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ سنڈے اسکول کی خصوصی کلاسوں میں ہوتے تھے۔

پادری صاحب کی سوچی ہوئی آسائشیں، ساون کی برکھا کی پھوار کی طرح ان پر برستی تھیں اور یوں آسمانوں کی بادشاہت والے کی مرضی پوری ہوتی تھی۔ اور کیسریا کا گھر (جسے مسٹر جوزف چرن ہمیشہ بنگلہ بولتے تھے) سفید لیس کے پردوں اور صوفہ سیٹ سے آراستہ تھا جو کلکٹر صاحب کی میم واپس جاتے وقت اس کو بخش گئی تھیں۔ بڑے ڈاکٹر ہنری صاحب کی میم صاحب نے پہلے کرسمس پر اپنے ڈریسنگ روم کی پرانی اُونی دری نکال کر بھیج دی تھی (ڈریسنگ روم میں قالین بچھ گیا تھا) جو اب اس کے ڈرائنگ روم کے وسط میں بچھی تھی۔ ایک اونچے سے اسٹول پر (مسٹر جوزف چرن نے فادر صاحب کے اسٹول جیسی سیاہ وارنش کی تھی) پیتل کا بڑا گلدان رکھا تھا، جس میں اسپراگس کی ہمراہی میں سفید گلاب مسکراتے تھے (ان سفید گلابوں کے حصول کی خاطر وہ دھونس دینے کے ساتھ ساتھ اس پر احسانات بھی کرتے رہتے تھے) سب سے زبردست گفٹ مدر ٹریسیا کا تھا کہ وہ جاتی دفعہ اپنی مہوگنی کی ڈائیننگ ٹیبل اور کرسیاں روزی کو بخش گئی تھیں، جس کے اعزاز میں جوزف چرن نے نیلام گھر سے ایک عدد کھٹارہ سا سائڈ بورڈ بھی خرید لیا تھا... چھوٹی موٹی چیزیں مثلاً کچن کا اسٹول ایک آدھ سائڈ ٹیبل انھوں نے اسٹور سے بھی اڑا لی تھی۔ اور اب یہ دوسری بات تھی جو روزی پر بھاری پڑتی تھی کہ اس کو تو چولھے کے پاس بیٹھ کر ہانڈی پونچھ پونچھ کر کھانے کی عادت تھی۔ وہ جھٹ کرسی پر پالتی مار لیتی۔ اس مقام پر مسٹر جوزف چرن کا چہرہ تانبے کی طرح تپ کر رہ جاتا۔ اور وہ لرزتی آواز میں صرف ڈارلنگ کہہ کر رہ جاتے اور

روزی ان میں چھپی تادیب اور تنبیہ کو بھی خوب سمجھتی تھی۔ اگرچہ اب وہ بھی مکتی فوج کے علاوہ تعلیمِ بالغاں سنڈے اسکول میں ممبر تھی۔ وہاں جا کر ریڈ کراس کے لیے چار سلائیوں والے موزے اور ٹوپ بنانا سیکھتی۔

اور تیسرا بھار جو اس نے بادلِ نخواستہ اٹھایا ہوا تھا۔ وہ بنگلہ کے برانڈے کا تھا۔ پادری صاحب کے برانڈے (برآمدے) کی طرح یہ بھی بانسوں کی جافری سے بند تھا مگر اس پر کاسنی پھولوں والی ریلوے کریپر پھیلی ہوئی تھی۔ کیسریا اس کو برانڈہ کم اور ڈربہ زیادہ کہتی تھی۔ اس کو تو کھلے آسمان تلے جامن کے گھنے درخت میں چارپائی ڈال کر بچوں کو دودھ پلانے کی عادت تھی۔ گرمی سردی دونوں ہی کی دوپہروں میں لیٹی ہوئی اور شانتی کیانتی سے اپنی جوئیں نکلوایا کرتی۔ پر اب تو وہ ان سے بھی گئی۔

اوّل دن سے فادر ان کو مشن اسکول کے ہوسٹل میں ڈال آئے۔ کیا گھر بھائیں بھائیں کرتا۔ اتوار کے اتوار آتیں تو دن ان کے نخروں اور خاطروں میں گزرتا... اور... اور اب تو وہ ان کی طرف نظر بھر کر دیکھنے سے بھی کتراتی۔ بابو لوگوں اور صاحبوں کی لڑکیاں جیسی لگتی تھیں، سایئے پہنے (روزی نے ہمیشہ بیٹیوں کی اسکرٹوں اور فراکوں کو سایئے ہی کہا) لمبے موزے۔ ہرن کھریاں (ہیل دار جوتے) پہنے رپ رپاتی ہوئی گھر میں داخل ہوتیں تو وہ یوں سہم جاتی جیسے ڈاکٹر صاحب کی میم صاحب آ کھڑی ہوئی ہوں۔

ایلما کا تو گندمی رنگ اتنا نکھرا کہ گیہواں گندمی نظر آتا۔ اس کا جسم لمبا اور دبلا تھا۔ نین نقش سیدھے سادے لیکن بڑی معصوم معصوم سی صورت نکلی تھی۔ روزی کو تو وہ بالکل ہی کوئی اور سی لگتی۔

رہ گئی آئیوی، تو اس کی چمکدار سیاہ رنگت اور بوٹے سے قد میں کچھ اپنائیت ضرور تھی مگر اس کی آنکھیں جیسے موتیوں اور ستاروں کو کچل کر بنایا گیا ہو اور گھنے اور لمبے بالوں کی چمک، اس کی چاکلیٹی رنگت پر مشن سے ملی ہوئی ڈچ اور سوئس کپڑوں کی تیز رنگ اسکرٹیں اور بلاؤزر اس پر ایلما سے زیادہ کھلتی تھیں۔ جب دونوں فرفر انگریزی

بولتی گھر میں گھستیں تو اس وقت تو پاپا جوزف بھی اپنے خول میں سکڑنے لگتے۔ اس کے سیاہ بوٹوں کے اندر سختی سے گھسے ہوئے پیروں کے نیچے تک اینٹھنے اور سکڑنے لگتے۔

(۶)

میں بنوکدنضر اپنے گھر میں مطمئن اور اپنے قصر میں کامران تھاO میں نے ایک خواب دیکھا جس سے میں ہراساں ہوگیااور ان تصورات سے جو نہ تو میں نے بلنگ پر لیٹ کر کیے اور ان خیالوں سے جو میرے دماغ میں آئے تھے مجھے پریشانی ہوئیO

مگر پاپا جوزف تو بنوکدنضر نہ تھا کہ وہ اپنے گھر میں مطمئن اور اپنے قصر میں کامران نہ تھا اور اس نے کبھی ایسا خواب بھی نہ دیکھا تھا کہ جس سے اس کو ہراسانی ہوتی۔ وہ اپنے گھر میں تھا تو چارپائی پر پڑ کر اتنا بے سدھ ہوتا کہ اس کے اندر خواب دیکھنے کی اہلیت ہی مفقود ہو جاتی۔

چناں چہ وہ جب اپنے قصر میں آتے تو بھی کبھی بنوکدنضر کی طرح پشیمان اور ہراساں نہ ہوئے تھے۔

لڑکیاں دیکھتی تھیں کہ وہ زندگی کے دو انتہائی متضاد گوشوں اور کناروں سے مکمل طور پر مطمئن تھے۔

پاپا تو جان تھے۔ پتلون، کوٹ، ٹائی فیلٹ ہیٹ، سب ہی کچھ تو بڑے شوق اور اشتیاق سے استعمال کرنے لگے تھے۔ جب وہ اپنے گٹھے سے چوکھونٹے پاپا کو بڑے اسٹائل سے منہ ٹیڑھا کر کے پائپ پیتے دیکھتیں تو وہ خوشی سے جھوم جاتیں اور جھٹ پاپا کی گردن پر پیار کر لیتیں۔ ''پاپا! یو آر اے ڈارلنگ۔'' وہ بڑی خوشی اور اعتماد سے ان کے ساتھ ہر جگہ جانے کو تیار ہوجاتیں۔ البتہ مما بعض وقت بڑا ایمبیرس کرتیں۔ ایک تو ان کو صفائی ستھرائی کا خبط تھا۔ چندن سا گھر رکھتیں مگر جھاڑو پکڑ کر شڑاپ شڑاپ خود ہی شروع ہو جاتیں۔ پھر انھیں ساڑھی کبھی ڈھنگ سے باندھنا نہ آئی۔ ڈاکٹر نے چشمہ لگایا تو اتار اتار کر ادھر ادھر ڈال دیتیں۔ بیٹھے بیٹھے وحشت ہوتی تو کچن میں پہنچ جاتیں اور مایا کو جھڑک کر ہٹا دیتیں۔

چل چل تو کیا پکائے گی۔ میں ہانڈیا خود دیکھوں گی۔ اسی سبب سے تو وہ دونوں اپنی فرینڈز کو گھر بلانے سے گھبراتی تھیں کہ مما وہی بنگالی عورتوں کے اسٹائل سے ساڑھی باندھے، آگے کو پلو پھیلائے، جس کے کونے میں چابیوں کا گچھا بندھا ہوتا، پھرتی رہیں گی۔ جوڑا بھی بنایا تو ایک چھوٹی سی گولی سا۔ جبکہ ان کی سہیلیوں کی مائیں اسکرٹیں وغیرہ بے تکلفی سے پہننے لگی تھیں اور بڑے اسٹائلش جوڑے بنایا سیکھ لیے۔ اور ماں جوزف تو ایسے مشوروں پر ایک دم بگڑ جاتیں۔ دور مارو۔ مجھ سے یہ بے شرمی نہیں ہوگی۔ تم ہی ننگی ٹانگوں سائے پھڑکاتی پھرو۔ مجھ سے نہیں دیکھے جاتے۔

بھلا آئیوی یا ایلما کو کیسے پتا چل سکتا تھا کہ مما نے آج تک کسی تبدیلی کو دل سے قبول ہی کب کیا تھا۔ وہ تو اب بھی اکیلی بازار نکلتیں تو مندر کی سیڑھیوں کے سامنے سے گزرتے گزرتے ہاتھ جوڑ کر پرنام کر لیتیں... اور یہ تو انھوں نے حد ہی کر دی کہ مکی کو جب ٹائی فائڈ ہوا تو چپکے سے جا کر پیر شہید کے مزار پر مٹی کی ہانڈی چڑھا آئیں۔ اور جو پپا کے کان میں بھنک بھی پڑ جاتی تو؟

یہ مما تو بس حد ہیں۔ کبھی کبھی ایلما چڑ جاتی تو آئیوی ترخ کر کہتی، ''آدمی کا من ہی تو ہے جانے کیا کیا سوچتا ہے اور کون کون سے خیالات اسے بے آرام کرتے ہیں۔''

وہ دیکھتی تھی کہ اس کی ماں اپنے گھر میں مطمئن تھی مگر اپنے قصر میں کامران نہ ہوئی... بلکہ بنو کدنضر کی طرح ہراساں رہی۔

آئیوی نے بی اے میں سائیکولوجی بطورِ خاص لی تھی۔

دیکھتے دیکھتے یہ چھوکریاں کہاں سے کہاں پہنچ گئیں۔

ماں جوزف کے علاوہ خود پاپا جوزف چرن بھی سوچتے۔

ایلما نے دس کر کے نرسنگ کا کورس کیا۔

اس کو تو شوق ہی عجیب عجیب تھے۔ ''میں تو بس نن بن جاؤں گی۔'' اس نے اچانک ہی کہنا شروع کیا۔ توبہ کی تو آگ بگولہ ہوگئیں۔'' تو نے اب یہ بول منھ

سے نکالا تو پھر میں جوتی اٹھا لوں گی۔ خبردار! آگے ہی بیاہ کو دیر ہوگئی ہے۔ ہمارے تو دس سال کی عمر میں لڑکی کے پھیرے دلوا دیتے تھے۔''

ایک تو مما اپنے پاسٹ کا اِتا ذکر کرتی ہیں کہ بھلا یہ کبھی کسی کو بھولنے دیں گی کہ... ایلما دکھ بھری آواز میں بڑبڑائی۔ آئیوی نے مما کی سائڈ (حمایت) لی۔

ایلما... انسان کی جو جو عمر آتی ہے وہ اپنے حال سے کٹتا جاتا ہے اور اپنے ماضی کی طرف رجعت کرتا ہے۔

مگر مما اپنے طور پر آگے بھی بولتی چلی گئیں۔ اور سنو میم لوگ کی نقل کریں گی۔ اری کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ یہ ببوا سی گوری گوری ان سفید اور کالی کفنیوں میں گڑیاں سی پھرتی اچھی لگتی ہیں۔ اور تم جو ان کالے بھوت پنڈوں پر یہ کفنیاں چڑھاؤ گی تو لوگ دن دیہاڑے ڈریں گے۔

ایک تو مما کا مبالغہ غضب ہے۔ اب بھلا ایلما کا پنڈا کالا بھوت ہے۔ اتنا تو آئیوی نے بھی اعتراض کیا۔

مگر ممی پر جب جن سوار ہوتا تو کس کی سنتیں۔ بس بولے جاتیں... بولے جاتیں... ارے میں کہتی ہوں مٹ جانی تو ہوش پکڑ لے اور یہ مما کے غصے کی انتہا ہوتی کہ وہ لڑکیوں کو ان کے سابق ناموں سے پکارنے لگتیں۔ تب پپا لرز جاتے اور تنبیہاً اپنی گھٹی گھٹی لرزتی آواز نکالتے۔

ڈارلنگ!

مگر دل سے وہ بھی خواہاں نہ تھے کہ ان کی سب سے بڑی بیٹی اس مرحلۂ عشق کی پہلی ہی منزل میں خاندان سے کٹ کر خانقاہ کی نذر ہو جائے۔ ابھی تو اس خاندان کو بہت منزلیں سر کرنا تھیں۔ اور ان آسائشوں سے فیض یاب ہونا تھا کہ پادری جانسن اس کے لیے خواہش مند ہوئے۔ پورے بارہ برس انھوں نے انتظار کیا تھا۔ کبھی کبھی وہ مشن کے ساتھ والے قبرستان جا کر پادری جانسن کی قبر پر بیٹھا کرتے تھے... جس کے ارد گرد سفید گلاب کے پودوں کو پانی دیا کرتے تھے۔

اندر سے فادر صاحب کی خواب گاہ کیسی ہوگی؟

ممکن ہے کہ ان کے اندر یہ سوال بھی سر اٹھاتا ہو۔

''اور محبت کی قربان گاہ پر جدائی سے بڑا تحفہ بھی کب کسی نے چڑھایا ہوگا کہ جدائی محبت کو امر کرتی ہے، فاصلوں کو قربتیں دیتی ہے۔''

☆☆

اور جب جدائی کے قدم محبتوں کے درمیان آتے ہیں تو وہ پہلے فاصلوں ہی کو مرتب کرتے ہیں۔ چنانچہ پہلا فاصلہ جو مرتب ہوا وہ پادری کی ذات کے سبب ہوا۔

وہ نن نہ بن سکی تو پھر ویکائی بن گئی۔ اور پہلے دن جب وہ اپنی خاکی وردی میں رپ رپاتی بنگلہ میں آئی تو مما تو ایسی ہوگئیں کہ بس سن کی سن ہی رہ گئیں۔ اور چائے پانی اور کیک فروٹ سے خاطریں کرتی رہیں۔ مگر منہ سے ایک لفظ نہ پھوٹیں (چہرے پر البتہ بسنت سی آئی ہوئی تھی)۔ ایک دم پیلی نظر آ رہی تھیں۔ مرعوب اور دم بخود۔ پاپا جوزف کا تو مارے غرور کے پیر زمین سے نہ لگتا تھا۔ اتنی جلدی کیپٹن کے بیج حاصل کر لیے تھے اس نے۔ بات بھی تھی مغروری کی۔ بات یہ ہے کہ بوبی (راجن) تو بالکل ٹھس مٹھا نکل گیا تھا۔ پاپا نے کہہ سن کر ریلوے یارڈ میں لگوا دیا تھا۔ اور اب یہ ۱۹۴۰ء کا کرسمس تو بس ان کے گھر جدائیوں ہی کے تحفے لایا تھا۔ کرسمس کے فوراً بعد ایلما کی روانگی تھی۔ اور اسی ہفتے بوبی کا تبادلہ ہوڑا جنکشن پر ہوگیا۔

چلو ٹھیک ہے اس کی جاب کی ذلت بھی ساتھ ہی دور چلی جائے گی۔ مگر یہ پاپا جوزف کی سوچ تھی۔

اور مما جوزف۔ ان کی نہ پوچھو۔

دسمبر کے جاڑے دیکھو اور کرسمس پڈنگ تیار کرتے کرتے پسینے میں شرابور ہوگئیں۔ چہرے پر ملتانی سی پھیر دی ہو جیسے کسی نے۔ ایسے ہی ایپرن سمیت اسٹول پر بیٹھ گئیں۔ دونوں لڑکیاں پکڑ کر بیڈ روم میں لائیں۔ مسہری پر لٹایا۔ مسٹر جوزف چرن سرہانے آ کھڑے ہوئے۔ تادیباً اور تنبیہاً ڈارلنگ کا لفظ دہرایا۔ دونوں لڑکیاں کرسی پر

آزو بازو آبیٹھیں۔ ایلما نے کورومین پلائی اور نبض پکڑلی۔ آئیوی نے جھک کر ان کی آنکھوں کے گوشوں میں اٹکے ہوئے موٹے موٹے آنسوؤں کو ننھے سے نازک ولایتی رومال میں جذب کیا۔ ان کے کھچڑی بالوں والے سر پر پیار کر کے بولی۔

مما تم کیوں فکر کرتی ہو اور مکی تو تمہارے پاس رہیں گے۔

ماں نے محسوس کیا۔ بوبی کا سر اس کے قدموں سے لگا ہے۔ پھر اس نے اپنی دونوں بیٹیوں کے بازو مضبوطی سے اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

پپا نے دوسرے کمرے میں جا کر پربھو (مکی) سے کہا، لگتا ہے ہم صبح کرسمس نہیں منائیں گے۔

مگر صبح کرسمس منائی گئی کہ ایک گھنٹے کے بعد مما نہایت استقامت سے کھڑی مڈنائٹ سپر کے لیے میز سجا رہی تھیں۔ انھوں نے گلدانوں میں سفید گلابوں کی نئی کلیاں بھریں۔ پھر خود مڈنائٹ ماس کے لیے سب سے پہلے تیار ہوئیں۔ اس دم پربھو (مکی) نے اپنا کیمرہ اٹھا لیا۔ فیملی گروپ پاپا بلیک سوٹ میں ایک دم نچ ان سفید رومال جیب میں سجا کالر میں کارنیش مسکراتا۔ درمیان میں مما اور پاپا تھے۔ چاروں طرف فیملی۔ بوبی کے موٹے بھدے سراپا پر پھنسی لال ٹی شرٹ بھی نچ رہی تھی آج تو!

آج مما سچ مچ مسکرا رہی تھی۔

آئیوی نے چپکے سے دل میں کہا۔ آج میری ماں اپنے قصر میں مطمئن و کامران ہوئی۔ اے آسمانی باپ اس کو ہراساں کر دینے والے خوابوں سے بچانا۔ کرسمس کی صبح نماز کے بعد وہ گرجا سے نکل رہے تھے تو مسٹر جوزف چرن حسبِ عادت واپسی میں ان کے ساتھ نہ تھے۔

سفید گلابوں اور اسپراگس کی ڈالوں کا گلدستہ اٹھائے وہ قبرستان کی طرف سرک گئے تھے۔

بڑی دیر وہ قبر کے پاس فادر جانسن کے سرہانے لگے کتبے کو گھورتے رہے۔ پھر اٹھنے سے پہلے انھوں نے دھیرے سے کہا۔ مقدس باپ... فادر صاحب۔ تم نے

جہاں پر بنتی ہے وہیں کی وہیں جم جاتی ہے، اس لیے کہ جس طرح سفر کرنے کے لیے ہمیں، آپ کو گاڑی اور اس کے پہیوں کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح خبر کو سفر کرنے کے لیے افراد، اجسام اور اجسام میں فٹ زبانوں اور سب سے بڑھ کر انسانی رابطوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

تو اب خبر سفر نہ کر سکی اور یوں ہمیں پتا ہی نہ چل پایا کہ پانی کی بہم رسانی کا سلسلہ اب منقطع ہوا چاہتا ہے۔ اور کچھ دیر ہی جاتی ہے کہ گھروں کے نلکے سائیں سائیں کریں گے اور پانی ہرگز نہ دیں گے اور حد یہ کہ الیکٹرک مشین کے بل بوتے پر چلنے والا گلی کا نلکا بھی عقل مند مصلحت کوشوں کی مانند ساری بے تابیوں اور بے صبریوں کے جواب میں خاموش ہی رہے گا۔ اور خاموشیوں کا یہ سلسلہ طوالت اختیار کرے گا کہ جب تک ٹربائن تبدیل نہیں ہو جاتا، نئے پائپ (اس لیے کہ کھدائی پر یہ انکشاف ہوا کہ کبھی کے پڑے ہوئے قدیمی پائپوں کا تن ہمہ داغ داغ ہے) نہیں پڑ جاتے، اب پانی کی توقع فضول ہے۔ اگر اس خبر کو سفر نصیب ہو جاتا تو ہم اس قابل ہو جاتے کہ پانی کا وافر ذخیرہ کم از کم ایک تمام دن کے لیے اسٹور کر لیں۔

اور اب نتیجہ اس شکل میں ظاہر ہوا کہ صبح صبح منہ دھونے کو غسل خانے کا نلکا کھولا تو سائیں! سائیں! گھبرا کر باہر آ کر دیکھا تو ان کی حوضیا میں بنا نلکا بھی کچھ ایسی گفتگو کر رہا تھا (قصہ یہ ہے کہ بے منہ دھوئے پھرنے کی عادت کو چھوڑے ہوئے مدتیں گزر گئیں۔ اتنی کہ اب یاد نہیں آتا کہ کبھی پھرے بھی تھے بغیر دھلا منہ لے کر)

تشویش، انکوئری، ہر طرف ٹوہ لگانے کی کوشش، یہی کچھ کر سکتا ہے انسان ایسے وقت میں۔

تب جا کر پتا چلا کہ اس وقت اس پورے علاقے کی انسانی آبادی باسی (بن دھلے) منہ لیے پھر رہی ہے۔

اور یہاں پہنچ کر پھر وہی سوال اور مسئلہ کھڑا ہوتا ہے کہ خبر کیوں نہ گرم ہوئی، ٹربائن پھٹ جانے کی خبر جہاں بنی وہیں جم کر کیوں رہ گئی۔

میرے جس گھر کو خوشیوں اور آسائشوں سے بھر دینے کی آرزو کی۔ اور اس کو حتی الامکان پورا کیا، اب اس میں جدائیاں آپڑی ہیں۔

فادر صاحب میرے بچے جا رہے ہیں زندگی کے سفر پر میرا خاندان بچھڑ رہا ہے۔ اور ان کی ماں بے قرار ہے۔ مگر میں ان کا صبر سے انتظار کروں گا۔ روحانی باپ میں تمہاری تقلید کروں گا۔ تم نے بھی پورے بارہ برس میرا انتظار کیا تھا۔

(۸)

پتا ہے یہ کرسمس ہم پورے اڑتیس سال بعد اکٹھے منائیں گے۔ یہ بات آئیوی بیگ نے اپنے نہایت ہی ماڈرن اور اعلیٰ ذوق سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر مسز ایلما دلیپ سے کہی تھی۔

اور اس کے بعد دونوں میں کوئی کلام نہ ہوا۔

دونوں چپ چاپ بیٹھی آتشدان میں رقصاں شعلوں کو تکتی رہیں...

آئیوی بیگ نے آج خاص طور پر اپنے آتشدان میں چیڑ کے لکڑ بھروائے جو رہ رہ کر چٹختے تھے اور چیڑ کی مہک ہر سو پھیلتی جیسے معبدوں میں مقدس خوشبوئیں سلگتی ہوں۔ پاپا ہمیشہ اس خوشبو کو لائیک کرتے تھے۔ ایک سوچتی تھی۔

اور تم آئیوی بیگ میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ تم اس محل جیسی کوٹھی میں رہ رہی ہوگی... تم سچ ہی کہا کرتی تھیں قسمتوں کا حال خداوند کے سوا کسی کو معلوم نہیں... دوسری سوچتی تھی۔

جب آخری کرسمس میں ہم اکٹھے ہوئے تھے اور ایلما دلیپ تم اوورسیز کی ویکائی یونیفارم میں رپ رپ کرتی آئی تھیں تو نروس ہوگئی تھیں اور تم کو چیف گیسٹ... مسز ہنری یا ڈاکٹر مارش کے طور پر لے رہی تھیں۔ اور پاپا کتنا proud feel کر رہے تھے۔ پاپا... پاپا تو جان تھے۔ سچی بات ہے ایلما تم اب پہلی بار بیگ کو دیکھو گی تو حیران ہوگی کہ یہ نوئیل بیگ اتنا ہینڈسم ہے۔ بھئی... مگر میرے پاپا کی ٹور ہی دوسری تھی۔ وہ ڈنر سوٹ اور سیاہ بو لگا کر کتنے starched نظر آتے تھے۔ یہ نوئیل بیگ

سوٹ سے چڑتا ہی ہے۔ کرتے شلوار میں پھرنا پسند ہے اسے تو!

سچی بات تو یہ ہے کہ اب میں خوش ہوں کہ دلیپ نے عین وقت پر یہاں آنے کا پروگرام کینسل کر دیا۔ اور عین وقت پر بہانہ کر کے مہاراشٹر چل دیئے۔ ورنہ یہاں آ کر خجل خوار ہی ہوتے۔ ایمان سے بڑے ایمبیرس ہوتے۔ کہاں وہ اور کہاں یہ آئیوی بیگ۔

(ٹکٹکی بیگ کی تصویر پر ہی جمی تھی) دلیپ تو اب بالکل ہی سوکھے قاق ہوگئے۔ جب سے دمے کا عارضہ ہوا ہے دونوں کندھے آگے کو جھک گئے ہیں۔

عجیب بات ہے۔ یہ ایلما اور میں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ یوں جڑی رہیں کہ لوگ ہمیں جڑواں بہنیں ہی سمجھتے تھے۔ اور اب ہم دونوں کے درمیان کیسی دوری سی ہوگئی ہے۔ میں ابھی اسے واہگہ سے لے کر آئی ہوں... اور میں بھی خوب سمجھتی تھی یہ سوشل کے لیے مانگنا چاہتی ہے۔ سوشل کو تو میں نے دیکھا بھی نہیں وہ تو لندن جا چکا تھا۔ انڈین ایئر لائینز میں ہے نا وہ۔ میں تو سوشیما سے بھی نہ مل سکی وہ الٰہ آباد میں تھی۔ شکر ہے تنگی ترشی کے باوجود اس کے بچے لائق ہوگئے۔ ایمان سے مجھے ان کی تنگی سے بڑا دکھ ہوا تھا۔ یہ اس دن پالم ایئرپورٹ سے مجھے ٹیکسی میں لے کر اپنے کوارٹر کے سامنے آئی تو مجھے یقین نہ آتا تھا کہ میری اور اس کی زندگی میں اتنا بڑا خلا واقع ہوگا (یہاں پر آئیوی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ کر کے آنسو گرے ہیں) میری زندگی اور اس کی زندگی۔

ایلما کی آنکھیں بھی اب آبگوں ہیں۔ کاش مما اور پپا ایک بار دیکھ سکتے کہ ان کی آئیوی ان کے سارے خوابوں کی تعبیر بن کر جگمگائی، ایسے خوابوں کی جنھیں دیکھنے کی وہ جرأت بھی نہ کر سکتے تھے۔ خیر مما نے کبھی خوابوں کی طرف توجہ نہ دی تھی۔ ان کو تو پاپا کے خوابوں کی وہ خبریں ہی ہراساں رکھتیں۔ کہاں...

آئیوی کا یہ گلبرگ جیسے علاقے میں محل جیسا بنگلہ (یاد رہے پپا ہمیشہ اپنے مشن والے ہٹ کو بنگلہ کہتے تھے) یہ بڑی سی گاڑی وہ خود چلاتی ہوئی مجھے

receive کرنے بورڈر تک گئی۔ اور میں کیسی پاگل جیسی قلی کے سر پر اپنا بیس سالہ پرانا سوٹ کیس اور بستر بند میں بندھا بستر اٹھوائے، مگن ہو رہی تھی۔ دور ہی سے اس کو دیکھ کر چلا کر اطلاع دی۔ پائن ایپل لائی ہوں تیرے لیے جی بھر کر کھانا اب... قلی نے سن کر اپنے ہاتھ میں پکڑی ٹوکری میں جھانکنا شروع کر دیا تھا۔ کاش میں اس وقت ہی اس کے چہرے مہرے سے اندازہ کرتی اور اس کے چہرے پر تحریر اقبال مندی کو پڑھ کر کچھ تو محتاط ہو جاتی... توبہ کیسی میں گاڑی سے لپ جھپ کرتی اتری ہوں۔ لال کور والی اونچی اونچی ساڑھی باندھے، کسا ہوا جوڑا بنائے (اب جو جو وقت گزر رہا ہے مما جیسے جوڑے ہی میں چین آتا ہے) میں نے تو اب تک اس کے چپسوں والے برآمدے کے فلور پر بھی نظر نہ ڈالی تھی۔ مگر جب براق سی سفید وردی سنہری کلاہ پر جمی پگڑی والا بیرا سامان اٹھانے کو سامنے جھکا تو اس کی پگڑی پر این بیگ (N. Baig) کا پیتل کا مونو گرام چمک رہا تھا۔ تو میرے سناٹے نکل گئے... تو کیا یہ نوئیل بیگ یعنی آئیوی کا بیرا ہے۔ خیر اپنا تو کیا ہے یہ میرا سامان آئیوی کو کتنا ایمبیرس کرے گا... مگر وہ... وہ تو بڑی مطمئن آواز میں حکم دے رہی تھی۔ ابراہیم جا کر بی بی گڈو کو بولو خالہ جان کا کمرہ اچھی طرح ٹھیک کروائیں اور ذرا باتھ روم پر تم ایک نظر ڈال لینا (تو لڑکیاں مجھے آنٹی کے بجائے خالہ جان پکاریں گی)۔

(۹)

ایلما کو کوئی آئیڈیا ہی نہ تھا کہ بے بی گڈو... کیسی ہوں گی۔ بات یہ ہے کہ اس نے اپنے بہنوئی نوئیل بیگ ہی کو کبھی نہ دیکھا تھا، نہ ہی اس کو یہ اندازہ تھا کہ بیگ کتنی بڑی کمپنی کے ایگزیکٹو اور شیئر ہولڈر ہیں۔

خوب صورت پرنٹڈ شلوار کرتوں میں اور رنگین گرم شالوں کو نہایت قرینے سے لپیٹے ہوئے دونوں لڑکیاں اندر آئیں تو میں چونک گئی۔ کسی مسلم گھرانے کی کشمیری لڑکیاں۔ شاید بے بی گڈو کی سہیلیاں ہیں۔ مگر جب دونوں آکر باری باری اس کے گلے لگیں، خالہ جان میں بے بی ہوں۔ اور میں گڈو ہوں (ایلما کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ

آئیوی سے حلفیہ بیان لے کہ یہ لڑکیاں خود اس کی اپنی ہی ہیں۔ وہ ان کو تکتی ہی چلی گئی۔ آنکھوں میں جیسے چاندنی سی اترتی چلی گئی۔ لڑکیاں تھیں بھی ایسی اجلی اجلی۔ کومل کومل جیسی۔ کونونٹ کی پالش اور فنشنگ۔ میں بھی کیسی مورکھ ہوں سوچ بیٹھی تھی کہ پاکستان جاؤں گی تو آئیوی کی ایک لڑکی کو سوشل کے لیے مانگوں گی۔ اچھا ہی ہوا کہ بالکل ہی جوڑا نہیں ملا... دلیپ کے میکے والے بھلا کب گوارا کرتے۔ ایک میں نے ہی ان کے گھرانے کو داغ لگا نشٹ کر دیا ہے... پھر فائدہ بھی کیا ہے ایسے جوڑ لگانے کا کہ میں اور دلیپ، ندی کے دو کناروں کی طرح الگ الگ سمتوں کو تمام عمر۔ سچی بات ہے، پاپا نے ہماری جدائی اور شادیوں پر جو کچھ اپنی ڈائری میں لکھا تھا لفظ بہ لفظ پورا ہو رہا ہے (حقیقت یہ ہے کہ مسٹر چرن ڈائری لکھا کرتے اپنی ٹوٹی ٹوٹی شکستہ رائٹنگ میں) تنہائی کا یہ ایک خوب صورت استعمال تھا۔ اور انھوں نے تین باتوں کو زندگی کا لازمی جز بنا لیا تھا۔ نمبر ایک پیتل والے گلدان کو، سفید گلابوں اور اسپراگس کی ڈالیوں سے بھرنا، نمبر دو، ہر سہ پہر کو آخری فیملی گروپ کے سامنے کرسی پر بیٹھ ڈائری لکھنا (وہ لکھتے تو ایک ایک لفظ کے ساتھ ان کا منہ کھلتا اور بند ہوتا تھا) نمبر تین کام، اتوار کو چرچ جاتے تو ڈارلنگ کو ساتھ والیوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف چھوڑ کر فادر جانسن کی قبر پر جانا اور سفید گلاب رکھنا (وہ یہ کام کیسے چھوڑ سکتے تھے۔)

(اس انسان نے جو اس قبر کی مٹی تلے سویا ہوا ہے پورے بارہ برس ان کا انتظار کیا۔ بڑے صبر سے... اور پھر جب وہ اس لائق ہوئے تو اس نے وہ سارے ارمان رفتہ رفتہ پورے کیے جن کے متعلق مسٹر جوزف چرن نے کبھی تردّد نہ کیا تھا) تو چنانچہ قارئین! اب ان کی ڈائری پڑھتے ہیں شکستہ اور ٹوٹا ٹوٹا خط... بے ربط اور ادھورے فقرے۔ جن کے بین بین وہ بائبل کی آیات ہیں۔

(۱۰)

''... اور ان میں سے ایک کھو جائے تو ننانوے کو بیابان میں چھوڑ کر اس کھوئی ہوئی کو جب تک مل نہ جائے کھوجتا رہے۔'' (متی)

اور خداوند خدا! میری تو تمام بھیڑیں ہی کھوئی گئیں۔ اور اب میں بیابان میں کس کو چھوڑوں اپنی ایک بھیڑ کو کھوجنے کے لیے۔

پاپا نے یہ اندراج اس وقت کیا تھا جب آئیوی وائی ڈبلیو سی اے کی وساطت سے کراچی گئی اور وہاں وائی ڈبلیو سی اے کی انڈر سیکرٹری کے طور پر کام کر رہی تھی۔

وہ ہمیشہ مجھے لکھتی ہے کہ جلد آؤں گی... آپ دونوں کو وہیں لے جاؤں گی... مگر میں نے ڈانٹ کر اس کو لکھا ہے۔ اس خیال سے آنے کی کوشش نہ کرنا آئیوی۔ تمہاری مما اور پاپا کو اپنے اصلی گھر اور آخری منزل کو اسی گھر سے جانا ہے جہاں انھیں فادر جانسن نے بٹھایا اور آئیوی... میں تمہارا پاپا جوزف چرن اسی قبرستان کے ایک گوشے میں دفن ہونا چاہوں گا جہاں وہ ابدی نیند سوتا ہے۔ اور میں اتوار کی اتوار اس پر اسپراگس اور سفید گلابوں کا دستہ رکھتا ہوں (اور یہ مسٹر جوزف چرن پر فادر جانسن کی ایک اور خصوصی رعایت تھی جو انھوں نے جوزف چرن کو دی تھی کہ اس کو گورا قبرستان کا ایک دور افتادہ گوشہ برائے دفن دیا جائے۔ جو فادر صاحب کا وعدہ ہے اور انھوں نے مجھے لکھت دی ہوئی ہے... اور آئیوی ایک دن جب تم آؤ گی تو اسی قبرستان کے کونے میں قبر کے سرہانے کھڑی ہو کر کتبہ پڑھو گی۔

مسٹر جوزف چرن۔ پیدائش۔ ــــہ نامعلوم۔

وفات۔ ــــہ جو بھی ہو۔

مسٹر جوزف چرن کی آنکھوں کے سامنے لاطینی رسم الخط میں لکھی تحریر ناچنے لگتی with special permission by Reverend David Johnson (اور کتبے کو ابھی عالمِ وجود میں آنا تھا)

ایک اور اندراج۔

روزی نے بوبی کے شدھی ہونے کا ذرا نوٹس نہیں لیا۔ کبھی کبھی مجھے شک پڑتا ہے وہ اس خبر کو سن کر تھوڑا سا مسکرائی تھی۔

ماؤں کا بھی پتا نہیں چلتا... کبھی کبھی... خیر۔

ایلما اور راجن ساتھ ساتھ گئے تھے (اب وہ اس کو پھر سے راجن کہنے لگی ہے) گھر سے۔ پھر جیسے وہ گھر کا راستہ ہی بھول گیا، سپنے میں آتا ہے، سدا سکھی رہے۔

اور میں سوچتا ہوں وہ تو اوّل دن سے کالی بھیڑ تھا۔ ایسی بھیڑ جسے سدھ ہی ہو کہ گلہ کدھر ہے... چرواہا کہاں ہے۔

میں سوچتا ہوں میں ہی اچھا چرواہا نہ تھا۔

اچھا چرواہا تو وہ ہوتا ہے۔ ''کہ اپنی بھیڑوں کو نام بنام پکارتا ہے... باہر جنگل میں لے جاتا ہے۔ پھر ان کو گنتی کے ساتھ واپس لاتا ہے۔ اور وہ اس کے پیچھے پیچھے اس کے قدموں پر چلتی ہیں۔ اس کی آواز پہچانتی ہیں۔ اور وہ کسی غیر کی آواز پر نہیں لپکیں گی اس لیے نئی طرز کی آواز نہیں پہچانتیں۔ (اقتباس متی)

اور جب میں اپنی بھیڑوں کا سوچتا ہوں تو ان کا حساب کتاب؟

لہٰذا باپ مجھے معاف کرے۔

ایلما نے رنگون کے محاذ سے دلیپ کے بارے میں لکھا تو میں نے پروا نہ کی۔ بچیاں تو یونہی اس عمر میں سوچا کرتی ہیں اور ایلما تو کب سے خانقاہوں میں جانا چاہ رہی تھی۔ پھر بیماروں اور لاچاروں کی سیوا کے خیال سے اس نے نرسنگ کا پیشہ اپنایا۔

ہمارا یسوع بھی تو دکھیارے مریضوں کو شفا دیتا تھا۔

پھر دلیپ والی بات پر روزی کا Reaction مسٹر جوزف چرن کی سمجھ سے باہر تھا۔ مما روزی نے کہا تھا... چلو پھر کیا ہوا پچھلوں سے ناتوں جا ملے گی۔

اب مسٹر جوزف چرن مما روزی کو کس طرح سمجھاتے کہ دلیپ اونچی ذات کا کھتری ہے۔ تمہارے ناتے ہوتے نا ان سے تو آج تم کیسریا سے روزی نہ بنتیں... مگر مما روزی کی تو اوندھی کھو پڑی ہو جاتی۔ (زیادہ تر)

مگر میں نے ایلی کو صاف صاف لکھ دیا تھا کہ مجھے اتفاق نہیں تمہاری تجویز سے اور یہ کہ گاڑی چلے گی نہیں... (اور نہیں چل پا رہی، دلدل میں دھنس کر رہ گئی ہے) نتیجہ یہ ہوا ایلی کے گھر میں نہ کرسمس منایا جا سکتا ہے اور نہ دیوالی پر دیپ مالا ہو پاتی

ہے۔ چھوکرا چھوکری بسورتے ہی رہتے ہیں... البتہ نانی ان کو بلا کر کرسمس منوا کر خوش کر دیتی ہے۔ سو یہ بھی ان کی زندگانی تک ہے۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا تم دونوں ندی کے دو کنارے بن کر جنم بتاؤ گے۔

ایلما کو بھلا دلیپ کی فیملی قبول کرتی۔ اور ہم تو دلیپ کو سر آنکھوں پر بٹھانے کو تیار ہیں۔ مگر وہ ہم سے گھن ہی کھاتا رہے تو رہے اور اوپر سے تنگدست ہیں۔ دونوں ملازمت کرتے ہیں پھر بھی تنگی ترشی... وہ تو یہ کہو ابھی یہ بڈھی بیٹھی ہے۔ مگر ایلما میری دکھی ہے۔ یہ دونوں لڑکیاں مجھے بیٹوں سے زیادہ پیاری تھیں۔''

یہاں پر ایلما کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے ہیں۔ اندراج پر پاپا کے آنسو بھی چمک رہے ہیں۔

اور اب اگلے اندراج پر دونوں بہنیں مسکرا دی ہیں۔ اندراج کچھ یوں ہے۔

''پیتل کے گلدان میں سفید گلاب اور اسپراگس کی ڈالیں مسکراتی ہیں۔ سفید گلاب، پرسکون خواب گاہ۔ جانسن فادر صاحب کی جافری پر ریلوے کریپر بہت پھیل گئی ہے اور اس میں گھنٹیوں کی شکل والے کاسنی پھول کثرت سے آ رہے ہیں۔ روزی اس کے پیچھے پڑ گئی ہے ہر وقت کہتی ہے۔''اس نامراد بیل نے برانڈہ اندھا کر دیا۔ مالی کو بولو اس کو چھانٹ دے۔'' (مالی کو میں نے اشارہ کر دیا ہے) بات یہ ہے جب میں بیل سے ڈھکی جافری والے برآمدے میں کینوس کی آرام کرسی پر بیٹھتا ہوں تو مجھے فادر صاحب کتنا یاد آتے۔ میں نے مایا کو بول دیا ہے کہ دس بجے کے ٹائم مجھ کو نیبو پانی بالضرور دینا ہے۔ موتیوں والی ڈالی سے جگ ڈھانک کر لانا ہے۔

مگر روزی، اب تو وہ بدلتی جا رہی ہے۔ اس وقت کچن میں مایا کو ڈانٹ ڈانٹ کر کڑھی چاول پکوا رہی ہے اور میں کہتا ہوں ڈارلنگ اس عمر میں ہمیں بالکل لائٹ ڈائٹ (Diet) لینا چاہئے... مگر بچے کیا گئے بالکل ہی خود سر اور گھنی ہوتی جا رہی ہے۔

آئیوی کے بیاہ کی خبر ڈورس نے دی تھی۔ اور اس وقت بیاہ کو کئی سال گزر

چکے تھے اور آئیوی کے بچے اسکول جانے لگے تھے، کسی کنونشن میں آئی تھی۔ خدا کی شان ڈورس نے یہ بھاگ لگا دیے ہیں، وہ بیچاری پتا نہیں قصور کہ گوجر خان کی کرسچن کمیونٹی کی نمائندگی کر رہی ہے۔

میں تو یہ کہتا ہوں یہ ڈورس ہمارے لیے اچھی خبر لائی ہے۔ آئیوی کی۔ ناقابلِ یقین خبریں۔ وہ کہتی ہے نوئیل بیگ بڑا آدمی ہے، ہینڈسم ہے اور ان کے گھر کا رہن سہن بالکل بدل گیا ہے۔ بالکل محمڈن طریقے، ڈریسز، ساڑیاں، حد یہ کہ ہیئر کٹنگ بھی موقوف، دوپٹے، لڑکیاں دفتروں، کالجوں سے آ کر گھروں ہی میں کچر مچر رہتی ہیں۔ نہ ہرٹ، نہ برن کوئی بال نہ کلب۔ بس زیادہ ہوا گاڑیاں پکڑیں اور کہیں مار آئیں۔ (مگر یہ ڈورس خود کتنا اترا رہی ہے۔ آئیوی کے لیے آواز میں حسد کی جھنکار صاف سنائی دیتی ہے۔

ڈورس سے اتنا بھی نہ ہوا کہ بچوں کی تصویریں لے آتی۔ ہم بیگ اور اس کے بچوں کو تو دیکھ لیتے۔ بس یہی کہے جاتی ہے۔ بہت بڑی بزنس ہے بیگ کی... گورنمنٹ کونٹریکٹر ہیں۔ اور نوئیل بیگ کا تو بڑا کلچرڈ بیک گراؤنڈ ہے۔ برٹش اور محمڈن کلچر کا مکسچر۔ مگر یہ آئیوی ہم کو خط بھی نہیں بھیج رہی۔ کبھی کوئی خط، کرسمس کارڈ کچھ نہیں۔ بھول گئی ہمیں؟ میں نہیں مانتا۔ مغرور ہوگئی ہے؟ یہ میں بالکل نہیں مانوں گا۔ خصوصاً آئیوی کے لیے... میں، میں سوچتا ہوں ایڈجسٹ کر رہی ہے۔ گھبرا رہی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کیسریا میرے نئے بنگلے میں کئی سال اجنبی سی رہی، خود کو گھر کی ملازمہ تصور کرتی رہی۔ خدا آئیوی پر رحم کرے۔ ایک تو یہ ہے کہ انڈیا پاکستان کے درمیان ڈاک بھی... خیر بھئی ہم کیوں کچھ کہیں۔ ویسے میرا جی کہتا ہے آئیوی، خوش رہے گی۔ بسے گی۔ آئیوی کو جینے کا ڈھب آتا ہے۔

اور یہ ایلما تو بچپن کی سٹرن ہے۔

☆☆

یہ روزی کا اور میرا رشتہ بھی دن بدن عجیب سا ہو جاتا ہے۔ ہم ایک

دوسرے کی تنہائی پر اس طرح ترس کھاتے ہیں جیسے خود اس میں مبتلا نہیں۔ روزی کو بچوں کے بچھڑنے کا اتنا غم ہے کہ یہ تک کہہ جاتی ہے۔ سچی بات ہے میں تو کلکٹر صاحب کی کوٹھڑیا ہی میں مگن رہی۔ بلا سے، میرے بچے تو بارہ بانٹ نہ ہوتے۔ پھر اس پوائنٹ پر ہم دونوں لڑنے لگتے ہیں۔ لڑتے لڑتے بے حال ہوجاتے ہیں تو ایک دوسرے کو کورومین پلاتے ہیں۔ اور پھر میں روزی کے آگے اعتراف کرلیتا ہوں۔ سچ بات یہ ہے روزی! میں اچھا چرواہا نہ تھا۔ اور اب تو اکیلا چھوڑ دینے کو کوئی بھیڑ بھی باقی نہیں۔

دونوں بہنیں اس گیسٹ روم (جو ایلما کے لیے بڑے تزک و اہتمام سے ٹھیک کیا گیا ہے۔ اور جسے استعمال کرتے ایلما بے حد جھجکتی ہے) مسہری کے کٹہرے سے پشت لگائے سر جوڑے بیٹھی ہیں۔ کمبل انھوں نے پیروں پر ڈال رکھا ہے۔ گود میں پاپا کی سالخوردہ شکستہ حال ڈائری کے پیلے مٹیالے ورق نظر آرہے ہیں۔

دونوں کی آنکھیں آبگوں ہیں۔ ڈائری کے اندراجات پر نظریں تیزی سے لپک رہی ہیں۔ وہ کبھی مسکرانے لگتی ہیں کبھی دانتوں کو ہونٹوں سے دبا لیتی ہیں۔ اس انداز میں جیسے درد و کرب کی شدید لہر کو دباتی ہوئیں، کبھی جلدی جلدی ورق لپیٹتی ہیں۔ اور اپنے مطلب کے اندراجات پڑھنے لگتی ہیں۔

بے بی گڈو شیشوں کی آڑ سے جھانک کر اپنی ماں اور خالہ کے انہماک پر حیران ہیں۔ آتشدان میں شعلے رقصاں ہیں۔ چیڑ کی مہک پھیلتی جا رہی ہے۔

خدایا ان کو ہوش نہیں۔ ڈنر کی گونگ دو دفعہ بجائی جا چکی ہے۔ وہ تو کہو ڈاڈا لندن میں ہیں ورنہ موڈ ہی خراب ہونا تھا ان کا۔ میں ابراہیم سے کہتی ہوں کہ وہ خود جا کر کہے کہ کھانا میز پر آچکا ہے۔ بے بی نے فیصلہ کرلیا ہے۔

نگاہیں تیزی سے نیچے اوپر آرہی ہیں۔

یہ پاپا کے آخری اندراجات میں سے ایک ہے۔

سلویا ڈینٹل سوئس ویزا پر الٰہ آباد آئی تھی۔ چار دن مشن میں بھی مہمان رہی۔

وہ بڑے شوق سے مشن کو ملنے آئی تھی مگر یہ نہ سوچا کہ بیس بائیس سال گزر چکے ہیں اب کون بیٹھا ہوگا سوائے ہم جیسے ٹوٹے پھوٹوں کے۔

سلویا بھی اب بوڑھی ہو رہی ہے مگر ظاہر کرتی ہے کہ وہ ابھی ایک دم فٹ ہے۔ خیر کتنا خوش ہو کر ملی ہے۔ بالکل ٹین ایجرس کی سی حرکتیں کرتی ہے۔ بات بات پر خوش ہونا پہلے تو Look Down کیا کرتی تھی ہم نیو کنورٹس جو ٹھہرے۔ (بس ایسا ہی سلوک ہوتا تھا New Converts سے) خیر ہم نے سلویا کو لنچ پر بلایا روزی نے بڑا اہتمام کر ڈالا۔ ہر چیز اپنے ہاتھ سے تیار کی، خصوصاً ڈگ روسٹ۔ ہم نے اس کی وجہ سے ڈنر پر چند پرانے دوستوں کو بلایا تھا... سارے ہی اولڈ ٹائمرز اکٹھے تھے۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ سب کی زبانوں پر گڈ اولڈ ڈیز کے قصے تھے۔ ہم نے اس دن تاش کی بازیاں لگائیں، پوکر اور فلاش کھیلے، قہقہے، آنسو، داستانیں، پرانے قصے۔ یہ بھی زندگی کا ایک یادگار ڈنر بن گیا۔

ڈنر والی رات میری سویٹ روزی نے کتنا اہتمام کیا تھا۔ بچوں کے جانے کے بعد یہ پہلا ڈنر تھا جس میں فادر صاحب والا ڈنر سیٹ نکلا۔ اپنے لیے مدت بعد بڑھیا ساڑھی نکالی۔ ڈھنگ کا جوڑا بنایا۔ ہلکا سا میک اپ بھی کیا۔ ایمان سے بچ رہی تھی ماں جوزف اس رات۔ میں نے پوچھا کہ آج تو بڑا ہی اہتمام کر ڈالا ہے۔

تو جھٹ بولی دیکھ رہے ہو۔ بہت پیسے والی ہوگئی ہے (توبہ ہے میری ان کا پچھلا حال یاد ہے) سنا ہے پاکستان میں پیسہ آ گیا ہے۔ بڑا مال ٹال معلوم پڑتا ہے (سوٹ کیس دیکھے تم نے اس کے) اتنی خریداری کر رہی ہے نوٹوں کی گڈیوں پر گڈیاں۔ چٹ چٹ ادائیگیاں کرتی ہے بٹوے سے نکال کر۔

اور بھئی اب ہمیں کچھ آئیوی کا بھی بھرم رکھنا ہے۔

اور پھر کھانے کے بعد کافی پر سلویا ڈینکل نے ہمیں سرپرائز دیا۔ اپنے بیگ سے نکال کر آئیوی کی فیملی کی تصویریں ہاتھ میں پکڑا دیں۔ رنگین تصویریں آئیوی اور نوئیل کی، اس کے بچوں کی، اس کے کتوں کی، گاڑیوں کی اور سب سے بڑھ کر بنگلے کی۔

وہ کمیونی کیشن کہاں گیا جو کسی بات کو خبر بنتے بنتے ہی پھیلا دیا کرتا۔

اور کمیونی کیشن کی بات یہ ہے کہ لمبی سیاہ تارکول والی چمکتی سڑک کے دونوں جانب بنی کوٹھیوں کے درمیان تو کوئی مواصلاتی نظام موجود ہی نہ تھا سرے سے کہ مین ڈورز سختی اور مضبوطی سے، ہمہ وقت بند رہتے اور سوائے خاکروب صاحبان کے کسی کو علم نہ ہو پاتا کہ ان گھروں میں انسان رہتے بھی ہیں۔ البتہ فلتھ ڈپو (چلیے اب ایک دیوار ہی سہی) سے مڑ کر آگے گھوم جانے والی گلی کا کمیونی کیشن بڑا براہِ راست اور استوار تھا۔

اور اب اس وقت میری سراسیمگی کا جو عالم ہے، اس کا ایک سبب ہو تو عرض کروں۔ جون کا مہینہ اور اس کی وسطی تاریخیں... اور یہ کہ گرما کی تعطیلات ہو چکی ہیں کہ اب یہ بھی نہیں کر سکتی کہ کالج ہی چلی جاؤں اس ابتلاء کو بھول جانے کی خاطر۔ تو چنانچہ اب صرف یہی کیا جا سکتا ہے کہ چھت پر نکل کر ٹہلا اور گلی کے نکڑ پر لگے خاموش نلکے کو تکنا شروع کر دیا جائے۔

اور اب جب کہ میں چھت پر پڑی کرسی پر بیٹھ کر گلی کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک (کہ جہاں پہلے ایک کچی آبادی بنام جھگیاں ہوتی تھی اور جہاں اب دومنزلہ خوبصورت اور خوشنما مکان تعمیر ہو چکے ہیں۔ اور یہ یقیناً اہلِ آبادی کے ہمت، حوصلے اور جفاکشی کو داد دینے والی بات ہے) دیکھ بلکہ تک رہی ہوں تو گلی کی افسردگی اور تنہائی کا عجیب سا احساس ہوتا ہے اور مجھے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی ہے بلکہ ایک طرح کا غصہ سا محسوس ہو رہا ہے کہ آخر میں نے اب تک یہ احساس کیوں نہ کیا تھا۔

اپنی بے تعلقی اور بے حسی کا سبب میں پانی کی اس ٹینکی کو ٹھہرا رہی ہوں جو چند سال قبل یہاں موجود نہ تھی اور میرے اور اس گھر کے پیچھے واقع گلی کے درمیان حائل نہ تھی... پہلے میں نے بالکنی سے اگلے حصے کو پردہ داری کے خیال سے انگور کی بیل کے ہرے بھرے پھیلاؤ سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس انداز سے جیسے وہ جنگل میں بیٹھے سادھو کی مڑیا ہو۔ لیکن اس کے باوجود اپنی بالکنی میں کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر اس گلی کے دم دم کی شریک تھی۔ یوں لگتا تھا کہ گلی بالکنی میں در آئی ہے اور بالکنی کے عین وسط میں

اُف خدا، یہ آئیوی کا بنگلہ ہے؟ کوئی چودہ کنال پر ہے (سلویا کبھی بھی حسد نہ کرتی تھی) یہ دیکھو یہ سوئمنگ پول والی! (توبہ کہو)

میں سوچ رہا تھا۔ ہمارے بے چارے انگریز کلکٹر کمشنر کب رہتے تھے ان بنگلوں میں۔ وہی سیمنٹ کے فرش، اینٹ پتھر بنگلے۔ سرخ کھپریلوں والی چھتیں۔ ہاں البتہ باغ شاندار، اور فرنیچر بھی کین کا یا لکڑی کا معمولی۔ اور ذرا یہ ایک ایک کمرے اور فرنیچر کو تو دیکھو۔ دل چاہ رہا ہے آئیوی کو ایسے بے جا اسراف پر ڈانٹوں۔ کیا زندگی اس سب کے بغیر ممکن نہیں۔ پھر وہ کیوں خو میں رہتے تھے۔ ایک کھٹارہ سی مورس یا فورڈ رکھ کر یا محض سرکاری جیپ ہی میں زندگی گزار جاتے تھے۔ خیر بھئی ہم کون؟ ہم نے کیا دیکھا تھا۔

تم جانو، تمہاری زندگی۔ مگر میں نے دیکھا ماں جوزف چپکے سے اندر سرک گئیں۔ میں نے جا کر پوچھا۔ کیوں، کیا بات ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے ڈارلنگ!

کہنے لگی کہ میں خدا باپ کا شکر کر رہی ہوں کہ آئیوی کبھی بچوں اور نوئیل کو لے کر یہاں نہ آئی۔ اور ہم نے بھی اب تک وہاں کا نہ سوچا۔ اور حیران ہو رہی ہوں کہ کیا نتی اس گھر میں کتنا اٹ پٹا محسوس کرتی ہوگی۔

بس یہ ہمارے گھر کی آخری گیدرنگ تھی۔

روزی کو جیسے آئیوی کے گھر بار، بچوں کی تصویروں کا ہی انتظار تھا۔ سلویا ڈینئل کے جانے کے تیسرے دن۔ ڈارلنگ میرے لیے بیڈ ٹی لیے میرے بستر پر نہ آئی۔ یہ مایا کا آف ڈے تھا۔ کافی دیر انتظار کے بعد میں نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر تنبیہاً آواز دی، ڈارلنگ! مائی ٹی۔ مگر وہاں کون تھا جو جواب دیتا۔

آج ۲۵ر دسمبر اور اتوار کا دن ہے۔

آج میں نے اپنے گھر پر بڑا اداس اور تنہا کرسمس منایا۔ گرجا سے نکل کر فادر صاحب کی قبر پر پھول چڑھانے گیا تو میں سچ کہتا ہوں مجھے یوں لگا جیسے اس میں سے سسکیوں کی آوازیں آتی ہوں۔

اور ہاں نئی بات۔ اب کی بار میں ڈارننگ روم کے گلدان میں تازے سفید گلاب اور اسپراگس کی ڈالیں بھرنا بھول گیا۔ وہی ایک دن پہلے کے باسی گلاب کام دیتے رہے۔

ایک نئی بات یہ بھی ہے کہ متھرا (مالی) ابھی دو دن پہلے تو مرا تھا۔ نیا مالی جو چرچ گریو یارڈ سے ترقی پاکر ادھر آیا ہے، وہ مجھے ابھی سے ہی رعب دینے لگا۔ بولتا تھا۔

جاؤ... جاؤ ہمیں سب معلوم ہے۔ یہ متھرا نہیں ہے۔ جے مس (جیمس) ہے۔ میرے پر کسی کا رعب نہیں پڑنے کا... ہاں بارہ سال سیوا کی ہے میں نے جانسن صاحب کی قبر کی۔ اور یہ تم تھے جو متھرا کو مشن میں ٹھونسے بیٹھے رہے۔ ہمیشہ جب اس کی بدلی کی بات چلتی۔ تم اس کی سفارش لے کر بشپ صاحب پر چڑھ جاتے... بھلا متھرا کا کیا حق بنتا تھا۔ ہندو بچہ... اور میں کرسٹان ہو کر بھی قبرستان میں پڑا رہا۔ بات یہ ہے متھرا تو رہتا تھا تمہاری دھونس میں۔

خیر... مجھے ایسا لگتا ہے کہ ایک وقت وہ بھی آئے گا جب مجھے اس باغ سے جانسن صاحب کی قبر پر رکھنے کو سفید گلاب نہیں ملیں گے (ٹپ ٹپ ٹپکے ہوئے آنسوؤں کے نشان)

اور وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔

اس کرسمس پر ایلما اور اس کے بچے بھی وش(Wish) کرنے نہ آئے... مہاراشٹر گئے ہوئے ہیں۔

اور آئیوی، اس کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا اور اب تو سرحدوں کے راستے بھی بالکل بند ہیں...

ابراہیم کھانا لگ جانے کی اطلاع دینے آیا تو اس نے دیکھا ڈائری بند رکھی ہے گھٹنوں پر دونوں اپنے پلوؤں سے آنکھیں پونچھتی ہیں۔

آج تو بچیوں نے حد ہی کر دی تھی ٹیبل سجانے کی۔ کھانا خیر وہ تو آئیوی

کے حکم سے تیار ہوا تھا... بارہ کرسیوں والی گول ڈائیننگ ٹیبل پر اتنا کچھ پٹا پڑا تھا کہ ایلما تو ایلما... خود آئیوی بھی نروس ہو رہی تھی۔ کہیں ایلما یہ تو نہ سوچ بیٹھے کہ یہ مجھے مرعوب کر رہی ہے۔

بے بی گڈو اور چھوٹا جمی بیگ تینوں بھائی بہن ہلکے پھلکے موڈ میں ہنس رہے تھے۔ جوکس سنا رہے تھے اور اپنے بھیّا مکی کو یاد کر رہے تھے جو اسٹیٹس مین تھے اور آج اس وقت وہ نیو یارک میں کرسمس نائٹ کا ڈنر کھاتے ہوں گے۔ ایک عدد گرل فرینڈ کے ساتھ۔ وہ ڈاڈا کو لنڈن فون کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

''ہمارا بھیّا بھی تو مکی ہے۔ ایلما کچھ پتا ہے کہاں ہوتا ہے۔'' آئیوی نے زیرِلب کہا ہے۔ لنڈن میں ہے۔''بس مما کے مرنے پر پاپا کو خط لکھا تھا۔ ایسا کہ جتنے دن زندہ رہے پاپا بار بار پڑھتے اور آنکھوں سے لگا کر روتے تھے۔'' ان فقروں کے بعد پھر وہ نہ بولیں، نظریں نیچی کیے اپنی اپنی پلیٹوں میں پڑا سلاد اور روسٹ ٹونگتی رہیں۔

مڈ نائٹ ماس...

☆☆

بارہ کا گجر... کیرل اور بھجن گانے والوں کی ٹولیاں اور پھر راہبوں اور راہباؤں کا مقدس اور باوقار جلوس۔ جب ننھے مسیحا کو اس کی کھرلی میں سے اٹھانے کو قطار در قطار نکلا...

سب کچھ۔ تمام رسومات بڑے ستھرے پن سے طے ہوتی گئیں۔ حتیٰ کہ ستارۂ سحر نے دم لیا۔ صبحِ کاذب کے جلو سے صبحِ صادق نمودار ہو رہی تھی۔ ان کا قافلہ واپس چلا۔ وہ یوں کہ نیلی ٹیوٹا میں جمی بیگ اپنی دونوں بہنوں کے ساتھ اور آئیوی اپنی سفید مرسڈیز خود چلاتی ہوئی ایلما کو ساتھ لیے روانہ ہوئے۔ بلا کی سردی تھی۔ کرسمس اور ۲۵ دسمبر کی روایت کے مطابق بوندا باندی خاصی آواز سے ہونے لگی تھی۔ لاہور کی سردی میں ایلما کا دانت سے دانت بج رہا تھا۔ آئیوی نے شیشے چڑھا دیے اور ہیٹر اون کر دیا تو آئیوی نے شیشے پر آئی ہوئی دھند کو وائپر سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

آ گیا۔ ہیپی کرسمس...

سیم ٹو یو...

اچانک ہی آئیوی کے منھ سے نکلا۔

شانتی! شانتی !ایک بات کہوں۔

ویسا مزہ پھر کبھی کسی بات میں نہ آیا جو اس دن مندر میں چوری چوری پوجا کرنے میں آیا تھا۔ کیوں... کیوں شانتی، جھوٹ کہتی ہوں؟

شانتی نے چونک کر کیانتی کو دیکھا۔

سچی بات ہے کیانتی وہ صبح ہی اور تھی۔ وہ سمے ہی دوسرا تھا میری تو آنکھوں میں وڈیا کی دکان کے سفید بتاشے ناچتے ہیں۔

[redacted] اور اسکول کی بچیوں کی طرح ایک دوسری کو

جب دیواریں گریہ کرتی ہیں

''لاہور شہر سے تانگے رفتہ رفتہ ختم کر دیئے جائیں گے۔''
ایک خبر کی سرخی

''جنگلی جانور ہماری دولت ہیں، ان کا تحفظ ہمارا قومی فریضہ ہے۔''
ایک نوشتۂ دیوار

دیوار، جس نے کہا کہ میں وہ دیوار نہیں، جسے بنانے والے ہاتھ نے گارے مٹی، کنکریٹ اور سیمنٹ کی مدد سے چنا ہو۔ یہ دیوار، شمس و قمر کے مسجود نے خود اپنی خاص توجہ اور عمل کی مدد سے بنائی۔

اور انسان نے ان کو مارگلا کی خوب صورت پہاڑیوں کے نام سے پکارا۔

''بابا جی! بچے کو بڑی حفاظت سے لے جانا۔ بڑی تاک سے واپس لانا... ایسا نہ ہو کہ کسی دن اسکول میں ہی وہ کھیلتا رہ جائے، اور تم اس کو بھول آؤ۔ اور یہ پھر اکیلا نکل پڑے... اور پھر... پھر...'' ایک ماں کے دل کا وسوسہ... جس کے آخری الفاظ کی

تکمیل کی اجازت اس کی مامتا ہرگز نہیں دے سکتی۔

"بی بی، فکر نہ کرو... یہ بچے تو میرا رزق ہیں، میرے موتی دانے، میرے چھلی دے کھیت، میری کنک دی فصل..." ایک مختصر سے، منحنی سے وجود کی زبان سے نکلا ہوا تیقن...

جس کے ایک ہاتھ میں سانٹا ہے... اور دوسرے میں اس کھیسی کا پلو ہے۔ جس نے اس کی خاکی شلوار، سفید کرتے کے ملگجے پن کو اپنے اندر چھپا رکھا ہے۔ ایک بس آتی تھی... اور دوسری جاتی تھی۔

بس پر چڑھنے والوں کا ہجوم تھا کہ بڑھتا جاتا تھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ کسی کے مطلب کی بس نہ آتی تھی، سب منہ اٹھا اٹھا کر اپنی گھڑیوں کے شیشوں میں مقید چلتے ہاتھوں کو دیکھتے تھے اور حیران ہوتے تھے کہ سارا عالم دو پیروں، دو پہیّوں، چار پیروں یا چار پہیّوں پر چلتا ہے۔ اور وقت ہے کہ دو ہاتھوں پر چلتا ہے، اور پھر بھی کوئی اسے پکڑ نہیں پاتا۔

بسیں آ رہی ہیں، بسیں جا رہی ہیں۔

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر وقت کے سوا کوئی نہیں چڑھ پاتا۔ اس لیے کہ دن تیزی سے ڈھل رہا ہے، دھوپ کی تابانی چپکے چپکے سرک رہی ہے۔

بچے کتابیں، بستے، اسکول کی یونیفارم، بھوک اور دھوپ کی تمازت سے تپے ہوئے چہرے... آتی جاتی بسیں... بے شمار پیلی چھتوں والی، مسافروں سے بے نیاز ٹیکسیاں...

یہ آبپارہ ہے... اور ہم یہاں مدت سے کھڑے ہیں۔ ہمارے سفری تھیلے اور ہاتھوں میں پکڑے اٹیچی کیس اور خود ہماری اپنی ذات۔ یہ سب چیزیں کتنی مہمل اور بے معنی نظر آ رہی ہیں کہ ان کا اشتراک اور اثبات فقط ایک سہ حرفی لفظ کو جنم دے گا۔

یعنی س۔ ف۔ ر۔ (سفر) کو...

سفر، جو آبپارے پر کبھی بھی جنم نہ لے سکے گا، عالمِ امکان میں نہ آ سکے گا،

اپنے روٹ سے آنے اور اپنے روٹ کو جانے والی بسوں کی سمت کو... آنکھیں اٹھانا اب ہمارے بس کی بات نہیں رہی۔ ایک ہی جانب گھورتے گھورتے آنکھیں اب بے سکت ہو چکی ہیں۔ ہم سب کی یعنی ہم تین مسافروں اور ہمارے رہبر کی... جو میرا نیم دیوانہ کزن کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ نیم دیوانہ یا بالکل ہی دیوانہ ہے لیکن اس کا خیال ان سے قطعی مختلف ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ وہ تو قطعی نارمل ہے۔ البتہ لوگ دیوانے ہیں۔ اور میرا خیال اس سے قدرے مختلف ہے۔ میں کہتی ہوں کہ نہ تو تم دیوانے ہو اور نہ لوگ دیوانے ہیں۔ البتہ تم دیوانے بنے ہوئے ہو، pretend کرتے ہو۔ اس لیے کہ تم نے فرار کی راہ یہی پائی ہے کہ اس روٹ پر چلنے کے لیے کسی میکانکی بس یا سواری کی کوئی ضرورت نہیں۔ جیسے کہ یہ بے چارے بچے ہیں کہ ان کو اپنے روٹ پر سفر کرنے کے لیے ایک عدد مشین یعنی بس کا سہارا درکار ہے۔

میں اب اپنے روٹ سے آنے والی بس کی سمت سے نظریں چرا رہی ہوں۔ یا یہ کہ وہ پتھرا چکی ہیں۔ اس قدر کہ اب وہ صرف ارد گرد، آس پاس بکھرے ہوئے بچوں ہی کو دیکھ سکتی ہیں۔ بچوں کے جمِ غفیر کو... دھوپ اور بھوک کی تمازت سے کملائے ہوئے چہروں والے بچے۔ گلوں اور کندھوں سے بستے لٹکائے اپنے اپنے روٹ کی جانب... میرا خیال ہے کہ شاید میں نے ایک بچے سے پوچھا تھا۔ سوال کیا تھا، ''تمہارے کُل کتنے گھنٹے گھر پر گزرتے ہیں؟'' اور یہ کہ ''تم صبح کتنے بجے گھر سے نکل پڑتے ہو، اور اگر تم اپنے ابا اماں کو کہیں دیکھو تو پہچان لو گے؟''

کیوں بھئی یہ کیا سوال ہوا...؟ پاس کھڑی ایک سواری کو اس سوال پر بڑی ناگواری ہوئی ہے۔ اس نے متنفر ہو کر منہ دوسری طرف پھیر لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے نورم (Norm) کی طرف سے تشویش ہے...

میرے نیم دیوانے (لوگوں کے بقول) کزن نے مجھے گھورا ہے، معترض نگاہوں سے، مگر بچہ؟

بچے نے قطعی برا نہیں مانا... اگرچہ اس نے میرے سوال کا جواب نوکِ زبان سے نہیں دیا۔ مگر اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں انڈیل دی ہیں۔

ان آنکھوں میں بڑا سناٹا۔ گہری خلائیں اور اسلام آباد کی کاجل سے کالی سڑکوں کی سی بیگانگی تھی۔ اور وہ مجھ سے میرے سوال کا جواب مانگتی تھیں۔

ایسا لگتا ہے ہمارا خاندان ہی دیوانوں یا نیم دیوانوں کا ہے! نیم دیوانے کزن کی سرخ سرخ ڈوروں والی غلافی آنکھیں اپنی ڈاڑھی کی سمت سے قطعی مختلف سمت کو تھیں۔ یعنی ڈاڑھی قطعی مخالف سمت میں تھی۔ باقی چہرے سے...

اور وہ کہہ رہا تھا اپنے مخصوص فلسفیانہ لہجے اور مناظرانہ آواز میں کہ اب اس وقت فی الحال آپ کے اس سوال پر آپ کو کیا کہا جا سکتا ہے۔ ''یہی کہ تمہاری طرح بنی ہوئی نہیں بلکہ سچ مچ...''

وقت کیا ہوگیا ہے گھڑی دیکھیں۔ اس نے حسبِ عادت بات کاٹی اور ڈانٹ کر کہا ہے۔

خاک گھڑی دیکھیں۔ اس شہر میں اس آبپارے پر کھڑے ہو کر یہ ٹیکسیوں والے... یہ آدم خور... الوؤں کے پٹھے۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ آپ کا ذاتی مشاہدہ ہے کہ کبھی کسی اصلی الو کے پٹھے سے کوئی بہیمانہ اور وحشیانہ فعل سرزد ہوا ہے...!

کوئی پاگل آدمی اگر اتنی ادق زبان میں اتنی فلسفیانہ گفتگو کرے تو خواہ مخواہ غصہ تو آئے گا، دل تو جلے گا۔

بھئی آپ دیوانے بنتے ہیں تو سیدھے سیدھے دیسی گیگلی گفتگو کیجیے۔ کیا ضروری ہے کہ... خیر میں نے منہ پھیر لیا ہے۔ یہ تمہاری گلیکسی ہے، کہ جانے میلوڈی... کتنی بار آپ کو بتایا ہے یہ... (اس کی ڈاڑھی کا زاویہ اپنے چہرے سے اتنا پھر گیا ہے کہ اب وہ ایک زاویۂ قائمہ یا شاید حادا بنا رہی ہے) سینما... جو ہے اس کا نام...

یہ ضروری ہے کہ میں تمہارے شہر کے سینما گھروں کے اور تمام بس اسٹینڈوں کے نام یاد رکھوں۔ ایک بس تو ملتی نہیں۔ پھر صفت یہ ہے کہ اس کی سڑکوں پر نہ رکشا چلتے ہیں اور نہ یہاں تانگے داخل ہو سکتے ہیں۔

''توبہ! اتنی primitive سواریوں میں بھی بعض لوگوں کو سوار ہونے کا شوق ہوتا ہے۔'' میرے سوال سے متنفر ہو جانے والی سواری، جس کی آنکھوں پر چھائے ہوئے گاگلز اس کے اپنے چہرے کی جسامت سے بھی بڑے ہیں۔ (معذرت! معاف کیجیے میں نے اپنے چہرے سے کہہ دیا ہے۔ یہ ایک فاش غلطی ہے۔ جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ اور چہرے اپنے ہوا ہی نہیں کرتے) دوسری طرف منھ کر کے کہہ رہی ہے۔ اور اس طرف اس سے بھی بڑے گاگلز خدوخال پہ سجائے کھڑی لڑکی ہنس رہی ہے۔ اور تھیلی میں سے نکال نکال کر مکا کی کھیلیں کھا رہی ہے۔ (معاف کیجیے گا غلطی پھر ہوئی۔ یہ مکا کی کھیلیں نہیں کہی جا سکتیں۔ اور ان کو پوپ کورنس اس لیے کہا جائے گا کہ یہ ایک امپورٹڈ برقی مشین کے ذریعے تیار کی جاتی ہیں۔ اور اس برقی مشین کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ فوٹو اسٹیٹ مشین یاد آجاتی ہے۔ اور اس تسلسلِ خیال کے فوراً بعد میں سوچنے لگتی ہوں (شاید میرا نیم دیوانہ کزن جو میرے خیال میں بنا ہوا ہے، ٹھیک ہی کہتا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ ہمارا خاندان ہی دیوانوں یا نیم دیوانوں کا ہے)

قدم قدم معذرت! اسی لیے تو بات وہیں کی وہیں ہے اور بس اپنی جگہ سے ہل کر یہاں تک نہ پہنچی۔ اور مجھے اڈے پر ایبٹ آباد کی بس پکڑنا ہے۔

پاپ کارنس، چہروں کی جسامت سے بڑے گاگلز اور تانگے کے نام... پر حقارت کا پوز اور دیوانوں کا پوز مارنے والے کزن کی گز چوڑی چھاتی پر منڈھی ہوئی سرج کی شیروانی کے بٹن، اب دور سرک رہے ہیں۔ اس کی ڈاڑھی اور میرے دماغ کا زاویہ بدل رہا ہے۔ ڈاڑھی اب زاویۂ قائمہ کو چھوڑتی ہوئی صرف ساٹھ ڈگری والے زاویے کی طرف گھوم رہی ہے۔

اور میں۔

چھن چھن... چھن چھن... ٹخ ٹخ... ٹاپ... ٹاپ۔ (گھوڑوں کے سموں سے نکلنے والی چنگاریوں کی قسم) کتنا پیارا نغمہ ہے۔ ٹخ ٹخ... ٹاخ ٹاخ ناہموار اور قابلِ اعتراض سڑکوں پر گھوڑا دوڑ رہا ہے... سانٹا چل رہا ہے... تانگہ بچوں سے لبالب بھرا ہے۔ نیلی، سرمئی اور سبز جرسیوں میں مگن بچے... بھاری بھاری بستے اور اٹیچی تھامے... سارڈین مچھلیوں کی طرح ایک پر ایک لدے اور ٹھنسے ہوئے قہقہے مار رہے ہیں ایک دوسرے کو گدگدا رہے ہیں، چھیڑ رہے ہیں۔ بابا سانٹا چلا رہا ہے۔ گا رہا ہے۔ کسی کو کھینچتا ہے۔ کسی کو گھرکتا ہے۔ حد یہ کہ زچ ہو جاتا ہے تو ماں بہن بھی کرنے لگتا ہے۔

اور ماں، بہنیں گھروں میں جلد جلد کھانا تیار کرنے، ہانڈیاں اتارنے، دسترخوان بچھانے میں لگی ہیں۔ ان کو بچوں کی آمد کے اوقات کی خبر ہے... ٹاپ ٹاپ... چھنن چھنن... اور قسم ہے گھوڑوں کے سموں سے نکلنے والی چنگاریوں کی... کہ اب میری نظروں میں ایک خبر کی سرخی اور کٹنگ ناچ رہی ہے۔

''لاہور شہر سے رفتہ رفتہ تانگے ختم کر دیئے جائیں گے۔''

تاکہ چہروں کی جسامت سے بڑی گاگلز لگانے والی لڑکیاں...

خبر کی سرخی بڑی تیزی سے فضا میں تیر رہی ہے، آنکھوں کے آگے ناچ رہی ہے۔

وَاِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ... اور جب سورج کو لپیٹ لیا جائے گا۔

میں اپنی گھڑی اور ڈھلتے ہوئے دن کی دھوپ کو دیکھ رہی ہوں۔

وَاِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ... جب سورج کو لپیٹ لیا جائے گا۔ تب اے بچو! تم کس سے اپنے گھر پہنچو گے...

وَاِذَا النُّجُومُ انْکَدَرَتْ... اور جب تارے بے نور ہو جائیں گے۔ پھر جب بسیں نہیں چل پائیں گی۔ تو اے بچو... وَاِذَا الجِبَالُ سُیِّرَتْ جب پہاڑ جلائے جائیں گے۔ تو اے بچو! مارگلا کی وہ پہاڑیاں خود چل کر تمہارے پاس آئیں گی۔ جن پر

جا بیٹھی ہے۔

اس وقت یہ گلی کتنی آباد تھی۔

کمیونی کیشن کتنا براہِ راست تھا۔

ان دنوں مجھے سب پتا تھا کہ آج کل کون کون سے کنبوں کے درمیان بات چیت اور حصہ بخرا اور کون کون سے گھر آپس میں شیروشکر ہو رہے ہیں۔ سامنے والی ایکڑوں زمین پر پھیلی کوٹھی کی دیواروں کو شیشے لگا کر بچوں کو دیواریں پھاندنے سے باز رکھا گیا ہے۔ بلکہ یہ تک پتا لگ جاتا تھا کہ چوں کہ ان دنوں کوٹھی کا سیاہ آہنی پھاٹک پاٹوں پاٹ کھلا پڑا رہتا ہے، اس لیے ضرور اس گھر والے بیرونِ ملک گئے ہوئے ہیں (اور اکثر وہ بیرونِ ملک گئے ہوتے ہیں۔ اپنی بڑی اور بے شمار کوٹھی پر تو تکلفاً ہی قبضہ قائم رکھا ہوا ہے) اور تو اور اس گلی کے آخری سرے پر واقع کچی آبادی کی اقتصادی اور معاشی صورتِ حال کا اندازہ تک میں اسی بالکنی میں کھڑے کھڑے لگا لیا کرتی تھی۔ فلاں کا کام اچھا چل رہا ہے۔ اب وہ نئی بائیسکل پر آتا جاتا ہے اور فلانے کا کام ان دنوں یوں ہی سا جا رہا ہے۔ چال میں تفکّر اور استغراق نظر آتا ہے۔

اب آپ اس کو مداخلتِ بے جا کہیں یا بے جا قسم کی ٹوہ اور تجسّس، مگر ایسے رابطوں سے ایک آسودگی اور سرور کا سا احساس ہوتا کہ میں اپنے اہلِ محلّہ کے نفس نفس کی شریک ہوں جن کے ہونے یا نہ ہونے کا احساس بھی ان تمام لوگوں کو نہیں جو سامنے والی یعنی گیٹ سے آگے چل کر دوسری سڑک کو چوک تک پھیل جانے والی اس سیاہ سڑک کے دونوں جانب واقع کوٹھیوں میں فروکش ہیں۔

ان تمام لوگوں کا کوئی مواصلاتی اشتراک اور رابطہ ان لوگوں سے نہ تھا۔ بھلا ان کو کیا پتا ہوسکتا تھا کہ کس کی لڑکی بستی بساتی واپس آکر ماں باپ کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گئی ہے، کس کی نسبت طے ہوئی ہے اور کس کی بات ٹوٹ گئی ہے۔

اب بھلا ان شریف لوگوں کو ان کی باتوں سے واسطہ رکھنے کی ضرورت بھی کیا تھی اور ایک میں تھی کہ اپنی بالکنی اور اس سے آگے پھیلی ہوئی انگور کی گپھا سے اپنی توجہ

لکھا ہے۔

''جنگلی جانور تمہاری دولت ہیں۔ ان کا تحفظ ہمارا قومی فریضہ ہے۔''

اے کاش میں یہ نوشتۂ دیوار اس کالی مرسڈیز بینز کے مالک کو پڑھا سکتی جو میری آنکھوں کے سامنے ایک اسکول کے بہت قریب ایک اسکوٹر پر اپنے بھائی کے پیچھے بیٹھے بچے کو گرا کر کچلتی چلی گئی تھی۔

لاہور کو خوب سے خوب تر بنانے کی خبروں میں سرفہرست خبر کی سرخی مسلسل فضا میں رقصاں ہے۔

''لاہور شہر سے تانگے رفتہ رفتہ ختم کر دیئے جائیں گے۔''

اِذَانُودِیَ لِلصَّلٰوۃ

دیوانگی کا پوز مارتے ہوئے کزن نے مسجد کی جانب دیکھ کر قرأت سے کہا۔

ڈاڑھی کا زاویہ اب حادّا ہے۔ اور ادائے نماز کو چل پڑا۔

اے نامعقول اب تم کدھر چلے... ہم بے نوا مسافروں کو چھوڑ کر، خبر دار جو ایک قدم آگے بڑھایا۔

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ادائے فرض میں مانع ہو رہی ہیں۔ یعنی کہ حائل۔

''تو ہمارا کیا بنے گا۔ بس کا اور روٹ نمبر کا تو پتا نہیں ہے۔ اور اگر بس آ گئی تو...''

''تو چھوڑ دینا۔ اگلی بس پکڑوا دوں گا...''

اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا یہ جا وہ جا۔ اور اس وقت ڈاڑھی چہرے پر دو مختلف زاویوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔

اور میں نے چکرا کر سر پکڑ لیا۔

یااللہ اس بچے کا کیا بنے گا۔ جس کو لینے اتنی دور سے چل کر جا رہی ہوں۔ شاید وہ میرا انتظار کرے گا۔

مگر وہ کب تک میرا انتظار کرے گا۔

مگر اس کو کیا خبر ہے کہ ہم اس کو لینے جا رہے ہیں۔

بائیں ہاتھ والے لڑکے نے ٹوکا۔

ٹھیک ہے مگر اس کی نیلی آنکھیں اور بالکل سنہرے جوٹ کی طرح کے بال...

وہ وہاں بہت تنہا اور ناخوش...

☆☆

گل بی بی نے گاؤں والوں کو جو کہانی سنائی وہی میں نے منظر منظر کر کے اس چھ ماہ کے اندر دیکھی، اور اس کو پرورش کیا ہے۔ لیکن قسم ہے، اندھیری رات کی کہ میں نے اس کہانی کا اب تک ایک لفظ بھی نہیں سنا۔ البتہ اس کی مکمل ٹیپ میرے اندر موجود ہے۔ ازابتدا تا انتہا۔ اور اس کی آواز میں۔

کون؟ کیا ؟ کون؟ کب؟

آپ کے تمام سوالوں کا جواب وہ خود دے گی۔

آپ صرف اتنا دھیان میں رکھنا کہ وہ ایک عورت ہے۔ اور وادی کی عورت۔ وادی کوئی بھی ہو۔ کشمیر، کاغان یا کیلاش۔ تمام وادیوں کی لڑکیوں، بیاہی عورتوں اور ادھیڑ عمر عورتوں میں صرف ایک بات مشترک ہوتی ہے کہ وہ وادی کے باغوں کے پیڑوں کی ڈالوں میں لٹکتے پکے سیبوں کی یاد دلاتی ہیں۔

کہانی کے سب کردار مرکزی ہیں، ضمنی کوئی نہیں۔

پلاٹ کے اعتبار سے ضروری کردار کچھ یوں آتے ہیں۔ ایک بیوہ جس کی ماہ رُو، ماہ تن، ماہ جبیں بیٹی نئی نئی بیاہی گئی ہے۔ ایک سنہری بالوں، نیلی آنکھوں والی میم!

اور پھر ایک سنہری بالوں، نیلی آنکھوں والا ٹورسٹ یا اگر عرفِ عام سے ہٹ کر اس لفظ کو ترک کرنا چاہیں تو پھر ریسرچ اسکالر، انتھرو پولوجی کا طالب علم۔ کوئی وقائع نگار یا دوسرے لفظوں میں... خیر چھوڑیئے۔ آپ ٹیپ سنیے۔ ''بازار میں کسی نے بتایا تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں نوکری نکلی ہے۔ باہر سے میم آئی ہے۔ اس کو کام کرنے والی

چاہیے ہے۔ میں فاقوں مرتی تھی۔'' بازار کے نکڑ والی مسجد کے نشیب میں میری چپل کے لکڑوں اور شہتیروں سے بنی جھونپڑی تھی۔ ماہ گل کو بیاہ دینے کے بعد داغ لگے گلتے ہوئے سیب کی طرح ٹوکرے کی تلی میں پڑی رہتی تھی۔ ماہ گل کے بیاہ کے بعد اس کے چاچے نے خرچہ دینا بھی بند کر دیا تھا۔ بھوکوں مرتی تھی۔ کام کی بات سنتے ہی میں گئی۔ اور کام کرنے لگی۔ مگر وہ مجھے کچھ دیوانی جیسی لگتی تھی۔ بالکل ہی ویسی تمام تمام رات بتی جلائے لکھتی پھر سو جاتی... سوتے سوتے جاگ پڑتی، پھر کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیتی۔ ابھی اذانیں بھی نہ ہوتیں کہ مشین میں کاغذ بھر کر ٹپ ٹپ کرنے لگتی۔ پھر جگا لیتی۔ گل بی بی۔ کافی چاہئے ہے... بری لگتی تھی، اس کی یہ عادت۔ دن کے وقت جنگل میں پھرا کرتی... کبھی کوئی پتی اٹھا لیتی، کبھی کوئی بوٹی۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگی گل بی بی تمہارے گاؤں میں جادو ٹونے سے کوئی علاج کرتا ہے! مجھے پہلے ہی شک پڑ گیا تھا۔ یہ کوئی شیطانی کام میں ہے... میں نے صاف کہہ دیا۔ بی بی، ہم مسلمان لوگ جادو نہیں جگاتے۔ جنگل کی جڑی بوٹی سے فائدہ نہ ہو تو نیچے جا کر پیر فقیر سے تعویز لکھوا لاتے ہیں۔ سو ہمارے گاؤں میں تو کوئی پیر فقیر بھی نہیں۔ اس کے بعد سے میں اس کی نگرانی کرنے لگی تھی۔ رات کو کپڑے اتار کر شیشے میں اپنے آپ کو ننگا دیکھتی۔ دیکھے چلی جاتی۔ پھر رونا شروع کر دیتی۔ مگر کبھی آواز سے نہ روئی۔ عجیب بات تھی۔ ماہ گل کی نوجوانی نے مجھ کو بوڑھا کر دیا تھا۔ اس کی جوانی کا روپ مجھے جوان کیے دیتا تھا۔ میں سمجھ رہی تھی، جادو مجھ پر اثر کر رہا ہے۔ مگر مجھے پیٹ بھی بھرنا تھا... ویسے وہ شریف بھی بہت تھی... بس لکھے جاتی تھی، ٹپ ٹپ کیے جاتی تھی۔ پھر ایک دن کاغذوں کے بنڈل بنا کر نیچے چلی جاتی۔ کئی کئی دن بعد واپس آتی۔

یہاں پر آ کر ٹیپ ٹوٹ جاتی ہے۔

بات بھی معمولی ہے کہ نیلی جین، براؤن اور سیاہ چیک کی شرٹ پر پشاور سے لیا ہوا فرغل پہنے، سواتی ٹوپی سر پر لگائے، کندھے سے ایک سفری تھیلا اور کیمرہ لٹکائے وہ نمودار ہوا... اور پھر اسی ریسٹ ہاؤس میں فروکش ہوا۔ اے لیجئے ٹیپ کا سلسلہ مل

گیا۔ ٹھہریئے ذرا میں اسے ٹیون کر لوں۔ وہ آ کر یوں رل مل کر رہنے لگا کہ میں سمجھی کہ میری میم کا صاحب ہے۔ مجھے کیا ضرورت تھی جو اس سے پوچھتی۔ وہ سارے سارے دن جنگل میں تنکے چنتی پھرتی۔ پتا نہیں کیا کھوجتی تھی... اور وہ اجلے اجلے پتھروں پر چڑھا بیٹھا فاران کے پانیوں کی تہہ میں چھپی ٹراؤٹ مچھلیوں کو چارہ دکھا کر پھانستا رہتا۔ ہرروز سیر ڈیڑھ سیر ٹراؤٹ بھنتی تھی۔

اور ہمارے لڑکوں نے ٹراؤٹ پکڑنے کی کوشش کی تو گارڈ آ کر کھڑا ہوگیا۔ اور اس نے ایک فیل مچا دیا۔ یعنی Fuss create کر دیا۔

''ٹھہرو، پہلے مجھے پیائش کرنے دو!''

''کیا مطلب۔ یہ مچھلی زمین تو نہیں کہ تم پیائش کرو گے۔'' لڑکے جھنجھلا گئے۔

''جی یہ مچھلی نہیں ہے۔ یہ ناران کی ٹراؤٹ ہے۔ اس کی پیائش ضروری ہے۔ ہم ان کی حفاظت کرتا ہے... ہم ان کا گارڈ ہے۔''

''اچھا تو کیا یہ بھی ان جنگلی جانوروں میں شامل ہیں۔ جن کی حفاظت کی تاکید مارگلا کی پہاڑیوں پر لکھی ہے۔''

''تم ہمارا ٹراؤٹ پکڑتا اور ہمارا مذاق اڑاتا ہے۔ چلو ادھر پکڑاؤ میں نمائش کروں گا۔''

اس نے فوری طور پر پیائش شروع کر دی۔ اور فیصلہ سنا دیا ہے۔

''نہیں... ناہیں... ہرگز نہیں یہ مچھلی دریا میں واپس جائے گی۔ پیائش سے ایک انچ کم ہے۔'' اس نے مچھلی دریا میں چھوڑ دی ہے۔

''کمال ہے... عجیب پاگل آدمی ہو... صبح سے ہم نے تین بار مچھلی پکڑی ہے اور تم ہر بار ایک دو انچی کم یا زیادہ کہہ کر پانی میں پھینک دیتے ہو۔ وہ بھی بلا اجازت اب سے اگر تم نے مچھلی واپس ڈالی تو ہم تم کو بھی دریا میں ڈال دیں گے۔ اور کہہ دیں گے یہ دو انچی کم تھا۔''

''چچ تم پھر مچھی بولتا۔ بابا یہ تمہارا لاہور کا مچھی نہیں ہے۔''

''ہاں نہیں تو پھر جنگل کا شیر ہے۔''

وہ غرّا رہے ہیں، اسے گھور رہے ہیں۔

وہ منھ پھیرے مسکرا رہا ہے۔

''ارے بابا ٹراؤٹ بولونا... یہ تو ہمارا ڈیوٹی ہے۔

اچھی ڈیوٹی ہے کہ تم صبح سے ہمارے سر پر سوار ہو اور وہ۔ اور وہ۔ وہ جو سفید بھتنا صبح سے مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ اس کو کچھ نہیں کہتے۔''

''اس کو پیائش ملوم ہے۔''

''چلو ہم چل کر اس کی مچھلیوں کی پیائش کرتے ہیں کمال ہے۔ ہم کیمپ پر کہہ کر آئے تھے ٹراؤٹ لائیں گے۔ آج وہی چلے گی۔ اب ہم تمہارا سر...''

''دیکھو صاحب گرم ہونے کا بات نہیں۔ ہم تم کو ٹراؤٹ پکڑ دیتا ہے۔ مگر اس کا مزدوری لگے گا۔ اور دیکھو راڈ کا کرایہ بھی تم دے گا۔ تیس روپیہ اور تین ٹراؤٹ کا حساب لگا لو۔ پچیّس روپیہ۔''

''مگر تین میں تو ہمارا پیٹ نہیں بھرے گا۔''

''تو ہم دوسرا آدمی لگالے گا۔ اس کی راڈ اور اس کا شکار کا پیسہ الگ دے گا۔''

جلے بھنے وہ بازار کی طرف اتر گئے۔ ڈھلان پر سے۔ بھوک کے مارے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ آج کا دن تو مارا گیا۔ آج تو اس لڑکے کو تلاش کرنا ممکن نہیں جس کے باپ کو جنگل میں جنوں نے مار دیا اور لاش بھی گم کر دی۔ اس شخص کو جسے گاؤں کے کسی آدمی نے کبھی بھی زندہ نہیں دیکھا تھا۔ میں اپنی چھولداری میں بیٹھی تھیلے میں پڑی کتابوں کو الٹ پلٹ رہی تھی۔ کہ بھوک کسی پر بھی توجہ جمنے ہی نہ دیتی تھی کہ بھنی ہوئی چھلیوں کا بوجھ اٹھائے جلے کڑھے چلے آ رہے تھے۔

تو اب ہم نے سوچا کہ ٹراؤٹ نہ سہی تو چھلیاں ہی سہی۔

یہاں کی مکا کتنی سوندھی اور میٹھی ہے۔

مکا کے دانے اور چھلی کے کھیت... خیال تو ایک بھنبیری ہوتا ہے۔ گھڑی اِدھر

گھڑی اُدھر۔ اسکولوں کے گیٹ، چھٹی کا گھنٹہ، گھوڑے، سانٹے اور موتی دانے۔ ساتھ ہی وہ چھوٹا بچہ جو ناران کے شفاف پانیوں جیسی نیلی آنکھیں اور بھٹے کے بال سر پر لیے راہ تکتا ہوگا۔

کس کی راہ!

اس کی جو اس کی ذات پر ایک مہرِ تصدیق لگا دے۔

اور میں جو کسی کے بھی شناختی فارم پر اس کی تصدیق کا اختیار رکھتی ہوں۔

شاید وہ میرا ہی انتظار کرتا ہو...

مگر وہ بچہ جو ابھی پورے تین سال کا بھی نہیں ہوا ہے۔ اس کو اپنی شناخت کی کیا فکر ہوسکتی ہے۔ اور ابھی اس پر شناختی کارڈ کی شق لاگو ہونے میں پورے پندرہ سال باقی ہیں۔

کٹ! ٹیپ کا بٹن دب گیا ہے۔ شاید خود بخود یا کسی آسیبی خلل کے تحت!

بازار کے ایک شخص کی آواز!

''میم صاحب کے جانے کے بعد بھی وہ صاحب جس کو گل بی بی اس کا صاحب سمجھتی رہی، ایک ہفتہ ٹھہرا رہا۔ اور پھر ایک دن صبح صبح اس نے اپنے تھیلے اور کیمرے کو کندھے پر لٹکایا۔ لمبی لمبی ٹانگیں مارتا ریسٹ ہاؤس کے خانساماں کے پاس گیا۔ اور اس سے کہا گل بی بی آئے گی تو اس کی میم صاحب کے کمرے کی چابی اسے دے دینا۔''

میں نے خود اسے کاغان جانے والی بس میں بیٹھ کر جاتے دیکھا تھا۔گل بی بی اس روز بیمار تھی۔ سارے دن دوپٹہ سر سے باندھے اپنی کوٹھی میں لیٹی رہی۔ دوسری صبح خانساماں نے چابی دی تو اسے یقین نہ آیا۔ بار بار ملال سے کہتی تھی۔ صاحب نے برا کیا ہے ہماری میم کی چابی گل خان کو دے دی۔ نہیں معلوم وہ خود ہی کیا کچھ لے گیا ہو...

اس کو تو صاحب کا نام بھی معلوم نہ تھا۔ اس کو گئے بیس دن گزرے، تیس

دن گزرے۔ میم صاحب ابھی تک نیچے سے واپس نہیں آئی۔ گل بی بی کی تنخواہ کا بھی کچھ ٹھیک نہ تھا۔ کام ہی نہیں تھا تنخواہ کیسی۔ یہ لوگ پائی پائی کا حساب کرتے ہیں۔ تب ایک دن گل بی بی تمام دن کسی کو نظر نہ آئی۔ اس کا گھر بھی بند پڑا تھا۔ جب کاغان جانے والی آخری بس بھی اتر گئی تو دس سال کا لڑکا سلطان ایک پیغام اس کی بیٹی کے نام لایا۔

تمہاری ماں نے شکور سے نکاح کر لیا ہے۔ وہ اس کے ساتھ آخری بس سے بٹراسی چلی گئی ہے۔ شکور کو جنگل بٹراسی میں کام ملا ہے۔ یہ چابی میم صاحب کی ہے۔ آئے تو اسے دے دینا۔ جو سنتا تھا حیران ہوتا تھا۔

اس نام کا کوئی شخص بستی میں تھا ہی نہیں... تیس دن اور گزر گئے۔ کسی نے کہا کہ اڈے پر میم صاحب سامان سمیت اتری ہے۔ میرا خیال تھا کہ اسے بتا دوں کہ چابی کہاں ہے۔ مگر وہ خود ہی اتر کر سیدھی گل بی بی کی بیٹی کے گھر چابی لینے پہنچ گئی، یہ بھی حیرت کی بات تھی۔

یہ ٹورسٹ بیورو کی چھولداری تنگ ہے، مشکل سے تین پلنگ، میز، کرسی اور واشنگ اسٹینڈ سمایا ہے۔

یہ دونوں مجھے بار بار ملامت کر رہے ہیں۔ آپ نے کیا یہ اتنی سی جگہ لے لی اور اتنا اچھا کمرہ چھوڑ دیا۔

دیکھو یہ میں نے خاص مقصد سے لی ہے۔ یہاں اس طرح بیٹھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آرہا ہے۔ یاد کیا آرہا ہے۔ ہر چیز، ہر منظر اتنا صاف نظر آرہا ہے۔ ایسی ہی چاندنی راتوں میں...

انھوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لی ہیں۔

''آپ پھر ہمیں اپنے ماضی میں، اپنے پاسٹ کے نوسٹلجیا میں کھینچیں گی۔ نو سر۔ سوری میڈیم ہمیں ہمارے حال سے متصل رہنے دیں۔

''پھر آپ اپنے وہاں کی باتیں اپنے ادھر کی باتیں شروع کر دیں گی۔''

تمہاری کوئی میرے ادھر سے لڑائی ہے۔

قطعی نہیں بلکہ ہم اپنے ہر پڑوسی کا احترام کرتے ہیں پر...

پر کیا... میرا موڈ آف ہونے لگا ہے۔

پر یہ کہ آپ اپنے فرسٹریشن اور نوسٹلجیا کو ہم پر مسلط کر کے ہوا میں معلق کر دیتی ہیں۔ دیکھیے ہمارا جذباتی تعلق...

او کے سر۔ یو آر رائیٹ... جل کر میں پھر پان کھانے بیٹھ جاتی ہوں۔ اپنے پاسٹ سے گہرا خاموش رابطہ قائم کرنے کے لیے۔

کٹ کٹ... نرم نرم آواز میں ماریا کا بیان۔

''وہ مجھے بالا کوٹ کے لاری اڈے پر ملی تھی۔ مہندی لگے ہاتھوں میں شہانی چوڑیاں۔ بڑے بڑے پھولوں والی سرخ چھینٹ کی تنگ مہری کی شلوار، اور گھیر دار کرتا۔ چوٹی میں گھنگروں والا پراندہ سجائے خوب چمک رہی تھی۔ مجھے یوں لگا کہ وہ امید سے ہے۔ میں نے اسے چھیڑا تو آنکھوں میں چراغاں سا ہوگیا۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ چابی اس کی بیٹی کے پاس ہے۔ اب مجھے کام کرنے کے لیے دوسری عورت تلاش کرنا پڑے گی۔ مجھے دو ماہ اور قیام کرنا ہے۔ آواز دھیمی ہوگئی ہے۔ ایک دبی سی سرد آہ... مگر مجھے تم سے یہ امید نہ تھی... جان... کٹ... پھر کٹ... کٹ...

بازار کا وہی شخص!

اب میں انگلیوں پر گنتا ہوں تو ان تمام مہینوں کو ملا کر پورے پانچ مہینے بنتے ہیں۔ پت جھڑ شروع ہو چکی ہے۔ کوہستان کی ہوا برف سے حاملہ ہو چکی ہے۔ بس ایسے ہی دن تھے۔ جب ایک دن لاری اڈے پر وہ آکر اتری۔ سیاہ لباس، ننگے ہاتھ، ویران چہرہ، اجڑے بال، گھڑا سا پیٹ... وہ ایک بگولے کی طرح اڑتی ہوئی اپنی بیٹی کے پاس پہنچی جو آٹے کا تھال پکڑے دہلیز پر کھڑی تھی۔ اس کے گلے سے چمٹ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ سب نے سمجھایا کہ دیکھ تو بیٹی کس حال سے ہے۔ بمشکل الگ کیا۔ ماجرا پوچھا تو یہ کہا کہ شکور کی جنگل میں جنوں سے جنگ ہوئی، لڑائی میں مارا

گیا۔ جنوں نے لاش بھی تو نہ چھوڑی۔ غائب کر دی۔

''چلو جو ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔'' ایک جھٹکے سے ٹیپ ٹوٹتی ہے۔ چل چل کر ختم ہو جاتی ہے۔

اس لیے کہ میں سو گئی ہوں۔ میں جب پریشان ہوتی ہوں تو نیند آجاتی ہے۔ آج میں آفس میں گئی تو اخبار رکھے تھے۔ غلطی سے اٹھا لیے۔

شائیں... شائیں... ہر طرف جلے ہوئے گوشت... گرے ہوئے مکانوں اور بلڈنگوں کے غبار کی بو... ٹینک... گلی ہوئی لاشوں کا تعفن... یااللہ یہ اخبار والے اتنا مبالغہ کیوں کر رہے ہیں۔

ناران جیسی جگہ میں بیٹھ کر ایسی خبروں پر یقین بھی تو نہیں آتا۔ یااللہ یہ دنیا اتنی خوبصورت بنائی تھی تو انسانوں کے دل کیوں اتنے... اتنا غصہ آرہا ہے... یااللہ میں کہاں چلی جاؤں... نہیں جاتی واپس... بس میں یہیں گم ہو جاؤں گی... لڑکے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ مگر ہمارے تو اسکول کھلنے والے ہیں۔ کھونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا... ہر ایک کا غم کرنے بیٹھ جاتی ہیں۔ کمال ہے... اور مجھے اب تک اس جگہ تک رسائی نہ ہو سکی۔ جن کے ذریعے وہ نیلی آنکھوں اور چھلی جیسے بالوں والا بچہ... ہاں تو اس کی پیدائش کا احوال...

اور یہ ایک بوڑھی دائی کا بیان' ہے جس کے ہاتھ پیر تقریباً ٹیڑھے ہو چکے ہیں۔

''ماریا میم صاحب کو دن رات یہی غم رہتا تھا۔ یہاں کوئی ہسپتال نہیں۔ کوئی ڈسپنسری نہیں۔ آخر لوگ کہاں تک جڑی بوٹیوں اور ٹوٹکوں پر گزر کریں۔ کم از کم ایک میٹرنی سنٹر تو کھل جانا چاہئے۔ صاف بات یہ ہے کہ ہم لوگ پہلے پہل اسے ڈاکٹرنی ہی سمجھے تھے۔ اپنے دکھ درد اور زخم لیے پہنچ جاتے۔ وہ غریب رو پڑتی تھی۔ ہاتھوں کے اشاروں سے کہتی تھی۔ ''لیکن..میں... میں ڈاکٹر نہیں۔'' مگر اس کی بات کون سنتا تھا۔ نتیجہ ساری دوائیں جو وہ اپنے استعمال کے لیے لاتی خرچ ہو جاتیں۔ پھر نیچے جاتی تو

پہلے سے زیادہ لاتی۔ اس دفعہ کئی بار یہاں کے بڑے لوگوں اور بعض محکموں سے بات کی وہ اپنا دکھڑا رونے بیٹھ جاتے۔ ڈاکٹر یہاں آنا پسند نہیں کرتے۔ وہ بڑے شہروں میں رہنا چاہتے، ہیں، تاکہ پریکٹس اچھی چلے۔ ماریا میم صاحب دوبارہ رو پڑتی۔

اس کو تسلی دیتی۔ تم فکر نہ کرو۔ ہمارا بھی اللہ مالک ہے جب ہی تو دیکھو ان ہاتھوں سے جاپے کرواتی ہیں۔ خیر وہ تو اب سدھاری۔ اللہ کی قدرت تو دیکھو ماں بیٹی پر ایک ہی گھڑی میں یہ وقت آیا۔ میں نے جیسے تیسے دونوں کو سنبھالا۔ دونوں کے لڑکے اندر سے باہر لائی۔ دونوں ہی لڑکے تھے۔ نہلایا، کرتے گلے میں ڈالے اور جب میں نے گل بی بی کے لڑکے کو مولوی کی گود میں دیا کہ اس کے کان میں اذان دے دو تو اس نے گھبرا کر اس کو یوں زمین پر رکھا جیسے اس کی گود میں شیطان کا بچہ آ گیا ہو... یہ بچہ کیسا ہے۔ اس نے شور مچایا۔ بھٹے کے بال سر پر نیلم کے دیدے، آنکھوں میں ڈلے ہوئے وہ بہت خوفزدہ تھا۔ میں نے اشارہ کیا بس خاموش رہو۔ اللہ کا دیا جی ہے۔ اس کے کان میں اس کا تو نام ڈال دو۔

اور جب ماں نے بچے پر نظر ڈالی تو پہلی مسکراہٹ کے ساتھ ہی آنسو چل نکلے اور دانتی بیٹھ گئی۔

اور افضل خان، گل بی بی کا داماد آج تک مجھ سے تنہائی میں بار بار پوچھتا ہے۔ تم کو اچھی طرح یاد ہے یہ بچہ میری ساس کی کوکھ سے نکلا ہے۔ اچھا کعبے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہو کہ ماہ گل کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

میں نے ہر بار کعبے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا ہے۔

ماہ گل کا اس بچے سے صرف اتنا واسطہ ہے کہ اس کی ماں کی کوکھ سے نکلا۔ اور یہ سب تو ہوا۔ مگر میں نے حماقت کی کہ میرے اور اس بچے کے درمیان اتنی رکاوٹیں کھڑی ہو چکی ہیں۔ اس لیے اتنی دور چل کر آئی اور رنج اٹھایا۔ میں کیا کرتی کہ جنیٹ جب یہاں طویل قیام کو ختم کر کے آئی اور میرے پاس دو دن رہی تو اس نے حسبِ عادت چند مختصر بلکہ قلیل الفاظ میں نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں اور عمر کے

اور نظریں گزار کر ان تمام وارداتوں سے متعلق رہتی۔ گلی کے رستے آنے والی اور گلی کے سرے سے نکل کر باہر جانے والی ساری براتیں برسہا برس میں نے اپنی نگرانی اور مشاہدے میں بھجوائیں۔ کوٹھیوں اور چھجوں پر بیٹھ کر جنگیں لڑنے اور معرکے سر کرنے والی خواتین کے سارے مجادلوں میں ایک مبصّر کے طور پر برابر کی شراکت کا لطف لیتی... اور اپنے اس بصری اور سمعی رابطے پر شرمندگی محسوس کرنے کی بجائے اندر ہی اندر فخریہ طور پر نازاں رہتی کہ میں ان لوگوں کے اچھے برے میں کسی نہ کسی طور پر شریک ہوں کہ جن کو زمین کا نمک کہا گیا ہے، جن کو شجرِ حیات کی جڑوں میں چھپا ہوا رس کہا گیا ہے کہ وہی رس ہے جو اس کے برگ وبار کا ضامن ہے۔

پر کچھ عرصے سے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ زمین کے طبقات اور تہوں میں چھپے نمک کی رَوکسی اور ہی جانب کو منتقل ہو رہی ہے۔ برگ و بار کی ضمانت دینے والی شجرِ حیات کی جڑوں میں چھپا رس راستے بدل رہا ہے۔ زندگی کی تہ داری اور رنگا رنگی میں وہ پہلے جیسی بات نہیں محسوس ہوتی۔ وہ اس طرح کہ اس گلی میں جو چلتی پھرتی مجلسی زندگی برسوں سے آباد تھی، وہ اب دھیرے دھیرے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی رونقیں ماند پڑنے لگی ہیں اور یہ صاف ستھری سیاہ تارکول سے بنی سڑک نما گلی اب افسردہ اور ویران ہونے لگی۔ پہلے شام سویرے اپنے اپنے کاموں سے آنے جانے والے لوگ یہاں چلتے چلتے ایک دوسرے سے علیک سلیک کرتے، مصافحے کرتے، بیٹا بیٹی کی شادیوں اور سسرال میں ہونے والے جھگڑوں اور بدسلوکیوں کے بارے میں مشورت کرتے۔

مجھے افسوس ہے کہ یہ ٹربائن کے پھٹنے اور پانی کی بہم رسانی کا سلسلہ ٹوٹ جانے کی بات کرتے کرتے درمیان میں یہ کیسے کیسے کام نکل آئے ہیں۔ لیکن اصل بات تو یہیں سے شروع ہوگی اور قصہ بنے گا تو اسی صورت میں، ورنہ شہر میں بہت ٹربائن پھٹا کرتے ہیں اور پھر مرمت ہو کر دوبارہ پانی دینے لگتے ہیں۔ یا پھر سرے سے نکال کر پھینک دیے جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے ٹربائن ڈال دیے جاتے ہیں۔

لیکن اس ٹربائن کی بات ہی دوسری ہے۔

کل تین سالوں کا المیہ سنایا۔

اس نے اپنے منہ سے گنتی کے چند لفظ نکالے تھے۔ لیکن اس کے چہرے پر شدید کرب طاری تھا۔ بعد میں پتا چلا وہ کرب مجھے دے گئی ہے۔ اور میں اسی اذیت سے دو چار ہوئی۔ جب میں نے بستہ گلے میں ڈالے اپنے احرام (یونیفارم) میں ملبوس بچے کو سیاہ مرسیڈیز کی لپیٹ میں آتے دیکھا۔ ایک شہاب ثاقب کو بے نور ہوتے دیکھا۔ اس نے آنکھیں کس کر بند کر لی تھیں، اور میرے اندر ایک تقریر جاری ہوئی۔

اور مجھے معلوم تھا کہ یہ ٹراؤٹ مچھلیاں نہیں۔ جن کی حفاظت کے لیے گارڈ پھرتے اور انچ انچ پر حفاظت کرتے ہیں۔ اور اب وہاں پوری وادی میں اور اس سے اوپر اور بازار سے بھی آگے چار پہیوں والی سواریاں دوڑتی پھرتی ہیں۔ اور یہ بے خوف و بے دل ہوتی ہیں۔ ان کے جی میں سیف الملوک پر اترنے والی پریوں کا خوف نہیں۔ چار پہیوں پر چلنے والی سواریاں ہوں یا ٹینک، یہ جب دوڑنے پر آجائیں تو بستیوں کو روندتی چلی جاتی ہیں۔

اور وہ بہت چھوٹا ہے۔ اور اس کا تحفظ اس لڑکی کے بس میں نہیں۔ جو اس کی ماں کی کوکھ سے نکلا ہے۔ کہ اس کا خاوند راتوں کو جگا جگا کر اس سے سوال کرتا ہے۔ سچ بتاؤ یہ تمہاری ماں ہی کی کوکھ سے نکلا یا گل جان نے تمہارے بچاؤ کے لیے رات کے اندھیرے میں اس کو تمہاری ماں کے پہلو میں لٹا دیا... یہ بات ہے تو خدا کی قسم میں یہ گولی اس کے سینے میں اتار دوں گا (اور وہ مجھے گولی دکھا کر کہتا ہے) تاکہ... تاکہ... تاکہ... پھر کبھی وہ کسی نئی زندگی کے ساتھ ایسا کھیل نہ کھیلے۔ جب ہی تو اس نے آنسوؤں سے بھرے گلے سے جنیٹ سے التجا کی تھی۔ میم جی... اسے تم لے جاؤ۔ ماں کے مر جانے کے بعد میں تو اس کو روٹی کا نوالہ ڈالتے بھی ڈرتی ہوں۔ اس کا کوئی پالن ہار ہے اور نہ کوئی محافظ (ہاں یہ کوئی ٹراؤٹ تو نہیں کہ اس کا انچ انچ ناپتا پھرے۔ بی بی ماہ گل...اس لیے تم پر صبر لازم ہے)

اور مجھ پر بھی صبر لازم ہے... کہ مجھے اس شخص کی آنکھوں کے رنگ نے

بہت خراب کیا ہے۔ جس نے اپنے اپنے پیاروں کی بقاء کے لیے گھی مانگا۔ اور گھی سیدھی انگلیوں نہیں نکلتا۔ اور اس نے اپنی انگلیاں... تو...

تو کچھ لوگوں نے کہا کہ وہ دہشت پسند ہے... خیر وہ جو کچھ بھی ہو۔ اب تو اس کے دل کے اجڑے نگر کو قرار دینا قرار پایا ہے۔

اور ٹینک چلے... بستیاں گریں... اور اپنے احراموں (اسکول یونیفارموں) میں موتی دانے، چھلی کے کھیت، مکئی کی فصل... سبُ خاک بسر ہوئے۔ شمس و قمر لپیٹ میں آئے اور سارے شہاب ثاقب اور نجوم بے نور ہوئے، اور وہ ساری بے نوریاں اور اندھیرے اپنی آنکھوں کے شبستانوں میں سہلاتا چلا گیا۔

میں اپنے دیوانگی کا پوز مارتے ہوئے کزن کی ڈاڑھی کو شدت سے یاد کرتی رہی کہ اب وہ کون سا زاویہ بنا رہی ہوگی۔ اس کی ڈاڑھی کے ان بدلتے زاویوں کے پیشِ نظر ہی میں نے ایک دن اس کو اپنی ڈاڑھی ترشوا کر کم کرنے کا مشورہ دیا۔

تو اس وقت اس نے نہایت خاموشی سے سنا۔ اور پندرہ دن بعد ایک نئے شہر میں جا کر ایک گرجتا برستا خط لکھا کہ چلو یہ بچا ہے کہ کام کالا سہی لیکن اتنا تو کر سکتا ہوں کہ ڈاڑھی کی سنت پوری کرتا رہوں۔ اور یہ کہ میں اس کی پیائش جانتا ہوں۔ ایک مشت اور نہ جانے کے انگل سے کم یا زیادہ نہیں ہونے دیتا (گویا آپ ناران کی مچھلیوں کے گارڈ ہیں) اور میں اس ڈاڑھی میں قطعی ہونق نہیں لگتا۔ نہ دیوانگی پوز کرتا ہوں۔ البتہ اپنے غم و غصہ کا اظہار بر ملا کروں گا۔ دنیا چاہے کچھ کہے مگر میں ظلم اور جفا کے واقعات پر سخت برہم رہوں گا۔ اس وقت تک... وغیرہ وغیرہ۔

اور آپ... آپ لوگ وی سی آر دیکھیے۔

ہاں تو بی بی ماہ گل، میں یہ کہہ رہی تھی تم پر اور ہم پر صبر لازم ہے۔ اور انتظار اس وقت کا... میں گھبرا کر بازار گئی ہوں۔ بازار کو اترنے والی ڈھلان پر لکڑی سے بنی ہوئی مسجد ہے، جہاں مؤذن اذان دیتا ہے۔ (بغیر لاؤڈ اسپیکر کے اور اذان کے آگے پیچھے گاتا بھی نہیں ہے) البتہ اس وقت وہ تلاوت کر رہا ہے۔ چٹائی کی صف

میں رحل آگے دھرے واذا لمر لرد سئلت اور جب اس لڑکی سے پوچھا جائے گا۔ جو زندہ دفنا دی گئی تھی بای ذنب قتلت کہ تو کس جرم میں قتل کی گئی تھی۔ تو پھر کیا ہوگا۔

اور یہی وہ وقت ہوگا جب
سورج کو لپیٹ لیا جائے گا
جب تارے بے نور ہو جائیں گے۔
اور جب پہاڑ جلائے جائیں گے
اور جب بیاہنے والی اونٹنیاں بے کار ہو جائیں گی۔
اور جب دریا آگ ہو جائیں گے
وہ وقت جب اعمال کے دفتر کھولے جائیں گے
اور جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی
اور تب اس وقت یہ ہوگا کہ
علمت نفس ما احضرت

ہاں سارے انکشاف اسی وقت ہوں گے۔

اور یہ شخص جو تلاوت کرتا ہے۔ خوش الحان ہے۔

اور اس کی سیاہ گھونگریالی ڈاڑھی میرے دیوانگی کا پوز مارتے کزن سے مختلف ہے اور متوازن ہے۔ وہ مجھے ان سیّدوں کی یاد دلاتی ہے جو بریلی سے چلے، اور بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔

اور اس وقت میں بہت حیران ہوئی کہ پہلے لوگ چل کر میدانِ شہادت کو جاتے تھے۔ اور اب شہادت خود چل کر بستیوں اور سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں آتی ہے۔ پھیری والوں کی طرح... ڈور ٹو ڈور سروس کرتی ہوئی... اور اوپر فضا میں... پرواز کرتی ہوئی۔

اور اے نیلی آنکھوں والے بچے ایک طرف تو ہے... دوسری طرف دُروں اور پہاڑوں کے راستوں چھپ چھپ کر آنے والے بے شمار بچے ہیں اور تیسری جانب

اپنے احراموں، گلوں میں بستوں والے ٹوٹے ہوئے شہابِ ثاقب ہیں۔ جو اپنا نور ابھی نہیں کھو سکے ہیں۔ بلکہ ان کی تابانیاں بڑھ رہی ہیں۔

اور ابھی مجھے اس اجڑے دل اور بجھی آنکھوں والے کی گود کا بچہ بھی لینا ہے کہ وہ اس کو اٹھائے پھرتا ہے اور اس کو گھی نکالنا ہے۔

اور اس کو دیکھ کر ایک شہر کی دیواریں گریہ کرتی ہیں۔ اور میرے اندر میرے وجود کی ساری دیواریں اور ان کی بنیادیں بھیگ چکی ہیں۔ میرے خاموش گریے کے اثر سے۔

اور مارگلا کی پہاڑیوں پر روشن الفاظ سے لکھا ہے:

''جنگلی جانور ہماری دولت ہیں، اوران کا تحفظ ہمارا فرض ہے۔''

بے قامت لوگ

جب دُلے نے مجھ سے ذکر کیا کہ پرلے میدان کے اورے جو بڑا نالہ ہے نا جی۔ نالے کے ساتھ ساتھ سرکنڈوں کے جھنڈوں کی اوٹ میں ایک بابے نے جھگی ڈالی ہے جی... وہ توقف کے بعد پھر گویا ہوا۔ صاحب جی! کہتے ہیں پہنچا ہوا بابا ہے۔

تو میں جو صحن میں کرسی ڈالے اخبار آنکھوں سے لگائے چھٹی والے دن سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کی بات سن کر کچھ بھڑک سا گیا۔ اخبار نیچا کر کے میں نے اس کو ڈانٹا۔

دیکھ دُلے! تو ان بابوں شابوں کے چکر میں نہ پڑ جانا۔ بڑے وہ ہوتے ہیں۔ کوئی پہنچے وہنچے ہوئے نہیں ہوتے... الٹا اگلے کو کہیں کا کہیں پہنچا دیتے ہیں۔

دُلا ہمارا دودھ والا تھا۔ تین پشتوں سے اس کے یہاں کا دودھ اس گھر میں لگا ہوا تھا۔

چھ فٹ تین انچ کا سیدھا تاڑ جیسا قد، اکہرا جسم اور چوڑے شانے، اس کی سانولی رنگت اور لمبی لمبی سیاہ آنکھوں سے بے فکری اور آسودگی پھوٹ پھوٹ کر دمکتی تھی۔

جستے سے بنی دودھ کی بڑی سی کین اٹھا کر چلنے لگا۔ تو میں نے پھر ٹوکا۔

''سن لیا ہے نا، خبردار... ہاں میں نے کہہ دیا ہے۔ پھر تجھے لینا دینا بھی کیا ہے ان جیسوں سے، تیرے خدا نے تجھے کچھ کم دیا ہوا ہے۔ پھر بیاہ تیرا ہوگیا۔ منڈا تیرے ہوگیا... مجاں تیری ایک کے بعد ایک سوہنی رہتی ہیں...''

جاتے جاتے وہ رکا اور اعتراف کیا۔''ناں جی! مجھے کیا لینا دینا... رب نے بہت رکھا ہے جی۔ بڑا فضل ہے اس کا۔'' میرے سامنے وہ رجا پجا کھڑا تھا۔

دودھ کی بالٹی اٹھائے وہ صحن سے نکل گیا۔ لیکن مجھے پتا تھا، اس کے دل میں کیا ہے۔ اور اس کیا ہے کی امیجری کچھ یوں بنتی تھی۔ اب اس نے ہماری چوڑی اور صاف ستھری گلی کے نکڑ پر کھڑی ریہڑی پر پیتل کی دودھ والی خالی گاگریں اور جستی بالٹیاں لادی ہیں۔ خود اچھل کر گھوڑے کی باگیں تھام کر بیٹھ گیا ہے۔ اس کا (عام ریہڑی کھینچنے والے گھوڑوں سے مختلف) چاق و چوبند اور خوب صورت گھوڑا ٹاپ ٹاپ کرتا اب سڑک پر آ گیا ہے... اب وہ نالے والے میدان کی طرف مڑ گیا ہے... نالے کے ساتھ ساتھ چلتا اب سرکنڈوں کے جھنڈوں میں چھپتا جا رہا ہے اور جھگی سے کچھ فاصلے پر اس نے گھوڑا روک لیا ہے اور خود کود کر اترا ہے۔

لٹھے کے دودھ جیسی سفید چادر اور لمبے سے سرمئی کرتے میں وہ سیدھا تاڑ قد لیے کھڑا ہوا ہے۔ اس نے اپنے پیروں سے چمڑے کا تلے والا کام کا جوتا اتارا ہے۔ مؤدب اور عقیدت میں ڈوبا پیتل کی دودھ والی گاگر اس نے اتار لی ہے اور اب وہ جھگی میں داخل ہوگیا ہے۔ گاگر اس نے بابا کے قدموں میں رکھ دی ہے اور خود کچے فرش پر دو زانوں ہو کر بیٹھ گیا۔

میں نے بے حد کوشش کی کہ اس امیجری میں بابا جی کا واضح چہرہ مہرہ نہ سہی پیکر ہی نظر آئے... مگر مجھے وہاں کچھ نظر نہیں آ رہا ہے... بابا جی کے مقام پر ایک خلا ہے البتہ وہ جیسے کسی کے حضور سر جھکائے سرنگوں بیٹھا کہتا ہے۔

''بابا جی... دعا کریں... مجاں کو شہر میں لانے کی مناہی ختم ہو جائے... سانوں

مجاں لان دی اجازت دی جائے۔''

ہاں مجھے پتا ہے یہی آرزو وہ لے کر گیا ہے...کئی برسوں سے رہ رہ کر وہ افواہ کے طور پر یہی خبر سناتا تھا۔

صاحب جی کہتے ہیں مجاں شہر وچ واپس لان دی اجازت ہوگئی ہے۔ وہ سرگوشی میں پوچھتا۔

کبھی وہ اپنا خواب سنانے لگتا، جو کچھ یوں ہوتا کہ مجاں شہر میں آ چکی ہیں۔ آموں کے باغ والے بچھواڑے میں کچے کوٹھے اور بھینسوں کے باڑے تیار ہو رہے ہیں۔

ہر شخص کی اپنی اپنی ایک آرزو ہوتی ہے۔

دُلے کے جی میں تو آخر ایک نہ ایک تمنا کو گھر کرنا ہی تھا۔

ہاں بس وہ یہی ایک سوال لے کر گیا ہے، مجھے یقین تھا۔ پھر دل کو تشویش سی ہوگئی... وہ بابا کوئی چکر ہی نہ چلا دے۔ ہاتھ نہ کر جائے اس کے ساتھ۔ یہ نہ ہو کہ کالا مرغ قبرستان میں اور کالا بکرا میدان میں چھوڑنے کی فرمائش کر دے۔ جہاں اس کے بندے لگے ہوں مرغ اور بکرے کو گھیرنے کے لیے۔

پھر فرمائش کا تانتا ہی لگ جائے۔

اور...اور...پھر اور...

ایک اور تشویش ہوئی جو اس سے بھی زیادہ وحشت ناک تھی۔کوئی منشیات وغیرہ کا چکر نہ چلا دے۔ اچھی اونچی اٹھان کا پاک صاف ستھری عادتوں والا جوان ہے۔

اور...اور پھر اس کے گلے میں تو کالے ڈورے میں بلا سونے کا تعویذ بھی پڑا ہے۔

تشویش بڑھتی گئی۔

دُلے کی تین پشتوں نے ہمارے بڑوں کو دودھ پلایا تھا۔ اس کی حفاظت میرا فرض ہے۔ بابا کا پتا کرنا چاہئے۔ اس کو پرکھنا ضرور ہے۔ کچھ ایسی ویسی ہوگئی تو...تو...

سوچ کر ہی دل لرز گیا تھا۔

سو میں نے طے کر لیا کہ اگلے جمعے کو بابا جی پر ایک طرح کا چھاپہ مارنا ضرور ہے۔

آٹھ دن تو میرا دُلے سے سامنا ہی نہ ہوتا۔ البتہ جمعہ!

پر جمعے تک تو بابا کے سارے بخیے...

لیکن دل میں اندر سے عجب سی ندامت بھرتی جا رہی تھی۔ دُلے کا تو محض بہانہ ہی ہے۔ تمہارے اپنے اندر بھی کوئی حاجت ہے...کوئی طلب...کوئی الجھن۔ دُلے کی آڑ لینے کے بجائے اپنے آپ کو اندر سے ٹٹولو۔

بابا تو بعد کی بات ہے، اپنے آپ پر چھاپہ ڈالو پہلے...

جو... جو دن سرک رہے تھے۔ یہ ندامت، یہ آواز اندر ہی اندر بڑھتی جاتی تھی جیسے اس نے مجھے آکاس بیل کی طرح اندر ہی اندر جکڑ لیا ہو۔

مجھے کچھ کچھ شبہ ہونے لگا جیسے یہ آواز بابا کی ہے۔ جیسے وہ اپنی جھگی میں بیٹھا بیٹھا ہپناٹائز کر رہا ہے۔ مجھے جھنجھلاہٹ سی ہونے لگی۔ کبھی اپنے آپ پر کبھی بابا کی ذات پر جسے میں نے ابھی دیکھا بھی نہ تھا۔

بالآخر وہ جمعہ بھی آ گیا۔

چپ چاپ میں نہایا دھویا۔ سفید کرتا شلوار زیب تن کیا۔ خس کا عطر گریبان میں لگایا۔ دھیرے دھیرے چلتا چلتا میدان پار کر کے نالے کے ساتھ ساتھ لگے سرکنڈوں کے جھنڈ سے گزرتا ہوا۔ اندر داخل ہوا۔ جھگی کیا تھی۔ پھوس اور ٹہنیوں سے بنائی تین دیواروں پر موٹا سا چھپر چھایا ہوا تھا...جس کا اُسارا عین وسط میں گڑا ہوا تھا۔ کچا فرش لپا ہوا... اور صاف ستھری کھجور کی ایک صف پر بابا جی بیٹھے تھے...سامنے کاٹھ کی رحل تھی جس پر قرآن دھرا تھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے پہلے ہی میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تاڑا تھا، نہ کوئی مرغ نہ کالا بکرا۔ نہ دھونی دینے کا سامان۔ البتہ جھگی کے ایک گوشے میں کاٹھ کے چوکھڑے پر ایک پانی کا گھڑا رکھا تھا۔ دوسرے گوشے میں مٹی

کا لپا پتا اجلا اجلا چولھا روشن تھا۔ مٹی کی ہانڈی میں دال پکتی تھی... ایک لمحے کو میں اس چولھے کو دیکھ کر سب کچھ بھول گیا... ایسے چولھے اور اس میں جلتی لکڑی کی مہک اور چٹک کیسی خاموشی سے ہماری زندگیوں سے نکل گئی۔ پوری جھگی چیڑ کی سلگتی لکڑی اور مسور کی پکتی دال کی خوشبو سے مہکتی تھی۔

بس یہی کل کائنات تھی جو مجھے یہاں نظر آئی تھی اور ہاں ایک طوطا بھی تھا جو بے قید جھگی میں پھرتا تھا۔ البتہ بولتا بالکل نہ تھا۔

اور...اور یہ جو صف ہے نا...اصل راز تو اس کے تلے ہی سے نکلے گا۔ میں نے خود کو دوبارہ شک میں مبتلا کرنا چاہا۔

اور...اور...یہ جو...یہ جو قرآن سامنے دھرا ہے نا کیا پتا محض دکھاوا ہو...اور پڑھنا ہی نہ آتا ہو...میں نے اپنے متزلزل ہوتے ہوئے خیال کو مضبوط کرنا چاہا۔

شاید میرے قدموں کی چاپ سنی تھی۔

نظر اٹھا کر دیکھا۔

نگاہ میں اندر آنے کا اذن تھا۔

میں جھک کر جوتا اتارنے ہی کو تھا کہ اشارہ کر دیا۔

گویا فرماتے ہوں۔

''آجاؤ...اندر... جوتے کا تکلف کیا ضرور ہے۔''

سو میں جوتا اتارے بنا ہی اندر چلا گیا۔

سن رکھا تھا...کہ بابوں کی لمبی لمبی جٹائیں ہوتی ہیں۔ منہ سے کف اور رال ٹپکتی ہے۔ بات کرنے میں تھوک اڑتا ہے۔ آنکھوں میں سختی اور سرخی عام رہتی ہے۔ انگلیوں میں رنگ برنگی نگینوں والی انگوٹھیاں گلے میں مالائیں...آزو بازو سرمارتے حق... ہو...حق کرتے ہوئے، بڑھے ہوئے گندے اور چیل کی چونچوں جیسے ناخن...

مگر... یہ کیسا بابا تھا۔ جس نے دُلے کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

صاف ستھرا لباس۔ چھوٹی سی کتری ہوئی ڈاڑھی اور ٹھیک ٹھاک بال...

مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر کلام پاک کو گردان دیا۔
آنکھ اٹھا کر دیکھا اور نظر جھکالی۔
میں نظریں جھکائے گردن ڈالے بیٹھا رہا۔
کافی دیر گزر گئی۔ نہ وہ بولے نہ میں بولا۔
کوئی بیزاری، آوازاری بھی محسوس نہ ہوئی۔
پھر میں اٹھا۔ اجازت چاہی۔
وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ مصافحہ ہوا۔ مسالمہ ہوا اور میں باہر نکل گیا۔
کوئی حاجت۔ کوئی طلب ہوتی تو بیان کرتا۔
پر اتنا اطمینان ہوگیا دُلا محفوظ ہے... چاہے ہزار بار آئے قطعی اور ہر طرح محفوظ ہے۔

بات آئی گئی ہو جاتی۔ پر کیسے؟ کہ ہفتے کے دن اپنے معمول پر آگے کو سرکے تو ہر سرکنے والے دن کے ساتھ رہ رہ کر ایک خیال سا پیدا ہونے لگا۔ دل میں تکرار سی ہوتی۔ اس جھگی میں کیسی سوندھی سوندھی سی خوشبو آتی تھی۔ اتنی کہ اپنے گریبان میں بسی خس کی مہک ماند پڑ گئی۔ رہ رہ کر گمان گزرتا کہ جیسے کسی نے حمام کی مٹی مٹھی میں تھما دی ہو۔ اور رہ رہ کر جیسے کوئی تکرار کرتا ہو۔

مشکی یا عبیری کہ از خوشبوئے دل آویزِ تو مستم۔
مستم۔ مستم۔

خیر یہ تو میں خوب جانتا ہوں کہ آدمی جو کچھ بھی سوچنے لگے تو وہی خیال پک جاتا ہے... اور احساس بن جاتا ہے۔

لیکن شاید مٹی کی وہی سوندھی سوندھی مہک مجھے کھینچتی تھی۔
اس نے مجھے کھینچا اور پھر کھینچا۔
میں آتا جاتا تھا۔ بات چیت بھی ہونے لگی تھی۔
بات بھی کیا ہوتی... اوّل تو بولتے ہی کب تھے۔ من گھنے سے نظر آتے۔ بس

کہ یہ ہمارے علاقے کی اس گلی کی دوطرفہ کوٹھیوں، کہ جن کے اندر رہنے والوں کے قدموں نے اس گلی کے سیاہ چمکیلے دھلے دھلائے فرش کو چھوا ہی نہیں۔ البتہ ان کی لمبی لمبی کاروں کے پہیے دن بھر میں متعدد بار اس کے لمس سے آشنا ہوتے۔ لیکن میری تو اور ہی بات تھی، بات یہ ہے کہ میں کسی ایسی کار میں سوار نہ تھی جس کے ہلکے آسمانی یا بنفشی شیشے آپ کو اتنا بھی دیکھنے سے باز رکھیں کہ پاس سے ابھی ابھی جو گزر گیا ہے اس کی رنگت سانولی تھی، کالی تھی یا پیازی اور ناک نقشہ تو بہت دور کی بات تھی... میں نے فرصت کے اوقات میں بالکنی میں کھڑے ہو کر بڑی سمعی اور بصری امدادیں حاصل کیں، ان سے جو پیشے کے لحاظ سے مستری، درزی، ترکھان جیسے ناموں سے پہچانے جاتے تھے۔ اونچے گھروں میں ان کی یاد جب ہی آتی ہے، جب اس نوعیت کی کوئی ضرورت لاحق ہوتی تھی لیکن ان سے اور چھاتا برداروں کے انداز میں شٹل کوک برقعوں میں ہوا بھر کر ان کا پچھلا حصہ پھریرے کی طرح اڑاتی سپڑ سپڑ جوتیاں گھسیٹ گھسیٹ کر چلتی ان کی بیگمات سے بڑا بڑا انسپریشن لیا... اور پھر سبزی والا۔

کیا بات تھی سبزی والے کی... اس کا کمیونی کیشن تو بڑا اہم تھا اور وہ تو اس گلی کی گہما گہمی اور رابطوں کا مرکزی کردار تھا۔ دن کے دس گیارہ بجے وہ سائیکل کے کیریئر پر رنگ برنگی سبزیوں سے بھرا پرا سا ٹوکرا جمائے نمودار ہوتا تھا (کتنی آرزو تھی مجھے اس سے سبزیاں خریدنے کی) چھٹی کا دن ہوتا تو میں بھی اس کے گاہکوں میں شریک ہوجاتی۔ اپنی ٹوکری کے ہینڈل میں رسّی باندھ کر لٹکا دیتی اور وہیں جم کر بیٹھ کر اپنا رابطہ ان سب سے استوار کر لیتی۔ ان سے بھی جو اپنی ٹوکریاں، سلور کے تھال اور پلاسٹک کے فیتوں سے بنے تھیلے لے کر خریداری کو نکل پڑتیں۔ نوعمر، بوڑھی اور ادھیڑ عمر خواتین کے علاوہ بارہ بارہ تیرہ تیرہ سال کی بچیاں بھی اس کے خریداروں میں شامل ہوتیں۔ وہ سب کی سب ایک ہالہ سا بنا کر اس کی سائیکل کے گرد جمع ہو جاتیں۔ گفتگو کا آغاز وہی کرتا صرف ایک مخصوص فقرہ۔

سناؤ جی کی حال اے۔

ایک آدھی یوں ہی عام سی گفتگو، کبھی موسم پر، کبھی گردو پیش پر، کبھی کسی آسمان پر اڑنے والے کسی پرندے پر۔

ایک دن ایسا ہوا کہ ایک بات منھ سے نکل گئی۔

شاید میں نے استفسار کیا ہو، کچھ یاد نہیں۔ بس یہ یاد ہے کہ میں نے کہا۔

''حضرت ایک عجیب سا احساس ہے جو مجھے پیتا رہتا ہے۔ کچلے ڈالتا ہے۔ شرمسار رکھتا ہے۔''

پھر میں نے رک رک کر پوچھا تھا۔

حضرت آپ متوجہ تو ہیں نا۔

بالکل... بالکل... جیسے مراقبے میں سے بولے ہوں۔

میں پھر عرض کیا۔

''ایک احساس ہے۔ عجب سا۔ جیسے چار طرف کشیدہ قامت... بلند و بالا لوگ ہیں۔ جدھر کو دیکھتا ہوں کوہ پیکر اجسام اور ان سب کے درمیان میں ہوں اپنی بے قامتی کے ساتھ۔ کچھ نہ ہونے کا احساس... میری بات مکمل ہونے سے پہلے چونکے... ایک نرم نرم نگاہ مجھ پر ڈالی۔

سبحان اللہ... کھڑے ہوئے۔

سبحان اللہ! بیٹھ گئے۔

پھر کھڑے ہوئے... سبحان اللہ... بے قامتی... اپنی بے قامتی کا احساس۔ آواز جیسے کہیں دور سے آتی ہو۔

حضرت مجھے خوف آتا ہے... میں ہراساں ہوتا ہوں۔ میں نے دوبارہ بات شروع کی۔ جیسے میں ابوالہولوں... اور اہراموں کے درمیان گھر گیا ہوں اور بے قامت ہوگیا ہوں۔ ابوالہولوں... اور اہراموں کے درمیان... یعنی تراشیدہ، پتھرائے ہوئے پیکر... دوسروں کے ہاتھوں دی ہوئی قامتیں... اور جو ان کے درمیان بھی اپنی بے قامتی کے احساس کے باوجود کوئی پھر بھی ڈٹا رہے... پیر جمائے کھڑا رہے... کتنی بڑی اور عظیم بات...

یہ پہلی بار تھی جو میں نے ان کو تیزی سے ٹہلتے اور بے ربط جملے ادا کرتے دیکھا اور سنا... میں سرنگوں بیٹھا رہا۔ان کی ٹوٹی، ڈوبی ڈوبی آواز کان میں پڑتی رہی۔

''اور... اور ایک میں ہوں...کہ اتنی ذرا سی بات کو بہت بڑا اسرار سمجھا... اور دربدر ہوا... اور یہ سوال... جب بھی... جب بھی دھیان میں نہ آیا... ایک یہ تھے کہ بستیوں، آبادیوں، اور دنیاداری کے ابوالہولوں کے درمیان کھڑے ہیں۔ آپ اپنے قدموں پر۔لیکن حضرت یہ سوال اور اس کا انکشاف تو آپ کے رو برو ہو کر میرے اندر واضح ہوا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے آواز نکالی کہ اس وقت ان کا جلال اور شکوہ اپنے منتہا پر تھا۔

مگر وہ اپنے آپ میں بولا کیے۔ میں بھی بولتا رہا۔

حضرت میں آپ کے رو برو بیٹھتا تو یہ احساس میرے سامنے یوں نمایاں ہوتا جیسے ٹیلی ویژن کی اسکرین پر بار بار لکھے ہوئے الفاظ میرے سامنے آتے ہوں۔

میں... میں... میرے روبرو؟... وہ بیٹھے اور اٹھ کر پھر ٹہلنے لگے... میں... میں گناہگار اتنی سی بات نہ کھوج پاتا تھا... میرے رو برو! نہیں حضرت، آپ خود اپنے روبرو ہوئے... چلو خیر... ایک بات تو ہوئی... ہم... یعنی ہم بے قامت۔ لوگ... آواز اب بہت نحیف ہوگئی تھی اور بہت فاصلے سے آتی معلوم ہوئی...وہ بیٹھ گئے مراقبے کے عالم میں... وہ اور میں ایک دوسرے کے روبرو گردن نیہوڑائے بیٹھے رہے۔

پھر میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔ سوچتا تھا میں نے ناحق بے چین کیا حضرت کو۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بڑے لمبے سفر سے واپسی ہوئی ہو۔ بہت گہرے نشیبوں سے چڑھائی کرتا کرتا کسی چوٹی کو سر کرنے کے بعد والی تھکان سے دوچار ہوں۔دو دن ہوگئے تھے دفتر ہی نہ جا سکا۔ گھر ہی میں چادر لپیٹے دھوپ میں لیٹا رہا... کوئی دس بجے کے قریب دُلا اپنی بالٹی لٹکائے گھر میں داخل ہوا... میرے سرہانے بیٹھ کر پوچھنے لگا۔

صاحب جی خیر تو ہے...آج کیسے لیٹ گئے، دفتر نہیں گئے۔

دُلے! تھک گیا تھا۔ بہت...

میں نے دیکھا دُلے کی آنکھ میں میرے لیے فکر مندی تھی۔

اللہ رحم کرے جی!

میں اس کو حوصلہ دینے کی خاطر بیٹھ گیا اور اس کو بہلانے کو بولا...اور سنا..

دُلے...سب ٹھیک ٹھاک تو ہے...

ناجی! کیا ٹھیک ٹھاک...ایک دم وہ افسردگی سے بولا۔

صاحب جی! میں نے ایک بار بولا تھا نا کہ پرلے میدان کے اورے والے نالے کے ساتھ ساتھ والے سرکنڈوں میں ایک بابا جی نے جھگی ڈالی ہے...(دُلا سمجھ رہا تھا کہ میں نے کبھی اس جھگی تک جانا تو ایک طرف رہا اس کا خیال بھی نہ کیا ہوگا اس خیال سے کہ میں اس کو ڈانٹوں گا کہ پھر تو بابوں شابوں کے چکر میں پڑا۔)

لیکن جب میں نے چونک کر سوال کیا۔

''اچھا! کب!''

تو وہ حوصلہ پا گیا کچھ اور آگے سرک آیا اور بالکل میرے منہ کے قریب منہ لا کر بولا...صاحب جی۔ رب دی سوں جدوں کا میں ریڑھی ادھر سے لے جا کر سلام کرنے لگ پیا تھا وڈی برکت ہون لگی سی...سوں رب دی میں کدی چلو دودھ بھی موڑ کے نہیں لے گیا...سارا کا سارا یوں (چٹکی بجا کر) وک جاندا سی۔''

اور اب اس کی آنکھوں میں بڑا گہرا ملال تھا۔

''وہ ہو سکتا ہے نہ ہی گیا ہو...تیرا وہم ہی ہو...'' میں نے بڑی آس سے کہا۔

''نہیں جی، چھڈ گیا جھگی۔ میں کل سلام کرن واسطے گیا تو پتا چلا۔ بابا جی تھاں چھڈ گیا۔''

بڑے اشتیاق اور سرگوشی میں کہتا گیا۔

''صاحب جی... صف ویسی کی ویسی پھیلی ہوئی۔ گھڑا۔ مٹی کا بدھنا۔ دال کی ہانڈی چولھے پر دھری ہوئی۔ صف پر رحل رکھی ہوئی...''

وہ سانس لینے کو رکا تو میں نے کہا۔

دُلے وہیں کہیں ہوگا پھر تو... ہوسکتا ہے رفع حاحت۔

''ناجی نا۔'' اس نے بات کاٹی۔ رحل پر قرآن نہیں تھا ناجی۔ بس او ہی چک کے لے گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ عجب خشبو والا بابا سی... صاحب جی جھگی میں ایسی سوندھی سوندھی مہک پھیلی تھی۔

اور پھر سرگوشی میں بولا۔ کسم ہے اللہ دی، کدی کچھ پیش کرنے کی ہمت ہی نہ ہوئی، حوصلہ ہی نہ پڑا۔ کتنا میرا جی کرتا تھا۔ ایک پیالہ دودھ تو پیش کردوں، مگر ہمت ہی جواب دے جاتی...''

''پھر جاتا کیوں تھا؟'' میں نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

''بس صاحب میں کب جاتا تھا۔ کوئی چیز تھی مجھے کھینچتی تھی۔ بس میں اندر وڑ جاندا۔ سلام کردا، ہور الٹے قدموں لوٹ آندا سی...''

کیوں۔ ٹھہرتا کیوں نہ تھا۔ میری بھی آواز جیسے فاصلوں سے آئی تھی۔

بس صاحب اپنا آپ اتنا چھوٹا... خاک کے ذرے ورگا لگتا۔ ہور... ہور

میں اٹھ کھڑا ہوا... ٹہلا... تو... دُلے تو نے بھی ایسا سوچا... دُلے تجھے بھی اپنی بے قامتی کا احساس... جی صاحب جی! میں شاید زور سے بولا تھا۔ اسی لیے اس نے دبک کر کہا۔

صاحب جی! آپ نے مجھ سے کچھ کہا ہے۔

''ہاں دُلے! ہم... وہ ہم کو بتانے آیا تھا...''

وہ ہونق ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں لرزتا لرزتا چارپائی پر گر گیا۔

''صاحب جی! کیا بات ہے؟'' وہ مجھ پر تشویش سے جھکا۔

''دُلے بیگم سے لحاف مانگ مجھ پر ڈال دے، مجھے جوڑی چڑھ رہی ہے۔''

اس نے مجھے لحاف میں دبکاتے دبکاتے سوال کیا۔

''صاحب جی! وہ ہمیں کیا بتانے آیا تھا؟''

''یہی کہ ہم بے قامت لوگ ہیں۔ لیکن اس احساس کے باوجود ہمیں اپنی جگہ پر قدم جمائے رہنا ہے۔''

یہ کہتے کہتے مجھ پر غفلت سی طاری ہوگئی۔

مشتِ غبار

عجب ماحول تھا۔عجب اسرار تھا۔

سارا علاقہ خوب صورت نو عمر عالیشان کوٹھیوں سے مزین تھا جن کو ماربل، سرخ پتھر اور آہنی گرلوں سے مضبوطی سے جما دیا گیا۔راوی کہتا تھا:

''پچھلے زمانوں میں باہر سے اتنی ٹیپ ٹاپ نہ ہوتی تھی۔ اندر سے باہر تک ایک لطیف ہمواری کے سوا کوئی چکا چوند اور خیرہ کرنے والی شے نہ ہوتی۔ ان کے جلو میں غریب غربا کے چھوٹے چھوٹے مکان بھی کھپ جاتے تھے۔ اس طرح کے علاقے کے آہنگ و توازن میں کوئی گڑ بڑ پیدا نہ ہوتی تھی۔محلہ ملی جلی حقیقتوں کے امتزاج سے بنتا تھا۔ اب محلے کا لفظ آج کی لغت سے خارج ہوا۔ اب نمبروں اور بلاکوں کا رواج ہے۔پہلے محلے کے گلی کوچوں کے نام ہوتے تھے۔گلی مرزا دبیر، کوچہ اعظم بیگ، چھتہ لال میاں۔ان گلیوں چھتوں اور کوچوں میں بنے ہوئے اونچے نیچے مکان،دیوار بیچ نکالی ہوئی کھڑکیوں کے ذریعے منسلک رہتے تھے۔احتیاج کی ایک صدا،دکھ کی ایک کراہ، اور کبھی کبھی گہری خاموشی بھی پورے محلے کو باخبر اور یکجا کر دیتی تھی۔''

میں جس اینکسی میں مقیم تھی۔ وہ علاقے کا دوسرا پرانا مکان تھا جس کے

احاطے میں قدیم اور کہنہ، بلند و بالا پیڑ کھڑے تھے اور احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ بہت مدّت کی لگی جھاڑیاں پھیل رہی تھیں، جو عرصے سے تراش خراش کی شرمندہ نہ ہوئی تھیں۔ میرا مالک مکان صرف درشت خو، مہیب اور پراسرار ہی نہ تھا بلکہ اس گھر کا ہر فرد عجیب وغریب تھا۔ گھر میں صرف ایک لڑکی ساتھ رہتی تھی جو نہایت خوش پوش اور فیشن ایبل تھی لیکن سننے میں آیا تھا کہ اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔ میں نے صرف دو مرتبہ اس گھر میں قدم رکھنے کی جرأت کی۔ دونوں ہی مرتبہ طوطی اپنے بکسے کھول کر بیٹھ گئی اور ایک ایک کپڑا اٹھا کر مجھے دکھاتی جو اس نے پٹھان اسمگلروں سے خریدے تھے۔ ایک ایک کپڑے کی قیمت بتاتی، کپڑے بہت ہوتے اور جوں جوں وہ کپڑے بکسوں سے نکالتی اس کی آنکھوں کی چمک میں آدم خوروں کی سی چمک پیدا ہوتی جاتی، مجھے اتنا کپڑا اور ان کی قیمتیں دیکھ دیکھ کر خفقان ہونے لگتا۔

ایک ہی خیال دہشت زدہ کرنے لگتا، اس کا تعلق کہیں غول بیابانی سے تو نہیں! مالک مکان کی جنونی طبیعت اور خونخواری مجھے ہر وقت خوفزدہ رکھتی۔ اس کو ایک تو یہ شک رہتا تھا کہ گورنمنٹ گاہے گاہے لوگوں کو اس کا کرایہ دار بنا کر بھیجتی اور اس کی مخبری کرواتی رہتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اول روز سے گریہ کشتن کا اصول قائم کرتا اور سختی سے عمل پیرا رہتا۔ علاقے کے چھوٹے سے مارکیٹ نما بازار میں اس شخص کے متعلق عجیب عجیب باتیں مشہور تھیں۔ مثلاً یہ کہ وہ ایک سکھ ہے اور اپنی جائیداد کی محبت میں نام بدل کر رہ رہا ہے۔ یہ بہت ظالم، سنگدل اور کنجوس ہے اور اس نے اپنی بیوی کو مار دیا۔ یہ اپنی بیٹیوں کی شادی نہیں کرتا۔ اس کے گھر کے تمام صحیح دماغ افراد رفتہ رفتہ اس سے کنارہ کش ہوگئے ہیں۔ ہر بات رفتہ رفتہ اپنے وقت پر درست ثابت ہوتی گئی۔

وہ دسمبر اور جنوری کی راتوں کو ایک اور دو بجے کے درمیان اپنی چھت پر چڑھ کر نہایت مہیب آوازوں میں مغلظات گالیاں بکتا جن میں گورنمنٹ، کل اہلِ محلّہ، کرایہ دار اور اہلِ پاکستان سب شامل ہوتے۔ وہ پوسٹ جو اس نے گالیاں بکنے کے لیے منتخب کی تھی، وہ عین میرے روشن دان کے قریب تھی، اس کی مہیب اور غول بیابانی کی سی

آوازوں سے آنکھ کھل جاتی، نیند اڑ جاتی، لحاف سے نکل کر بتی جلانے اور مطالعہ کرنے کی ہمت نہ پڑتی۔

ترساں ولرزاں کالج سے واپس آتے ہی جلدی جلدی کام ختم کرتی برآمدے کی جافری کو مضبوطی سے مقفل کر کے سو جاتی۔ پھر دن ڈھلے مجبور ہو کر اٹھتی تو کمروں کی صفائی اور آرائش میں کچھ وقت گزار کر گردو پیش کے ماحول اور اسرار سے بچنے کی کوشش کرتی یا ٹوکری اٹھا کر بازار کو نکل جاتی۔ دیر تک بے ضرورت خریداری اور دکانداروں سے تبادلۂ خیال میں وقت گزارتی اور اس طرح ان ہی دنوں میں مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ بازار کی رونق اور گہما گہی، خوف، دہشت اور تنہائی سے فرار کا ایک راستہ ہے۔

میرا زیادہ وقت مٹی کے برتنوں کی دکان کی طرف صرف ہوتا۔ کورے کورے سرخ سرخ سفالیں، پیالے، کنڈالیاں، مٹکے، حقے اور بدھنے مجھے اپنی صدی سے اڑ کر پچھلی صدیوں اور ان قدیم زمانوں میں پہنچا دیتی تھیں۔ وہ دن جب کرنسی کے بجائے تبادلۂ اجناس کا سسٹم چلتا تھا۔ بازار میں نکلنے سے پہلے آدمی کو اپنی جیب نہیں اپنا ہنر، اپنا فن ٹٹولنا پڑتا تھا۔

ایوان میں سفید براق چاندنی کا فرش تھا۔ اس پر کاشانی قالین بچھا تھا، مخملیں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے لگائے اس عہد کے ہنرور نے اپنی دراز ریش پر فکریہ انداز میں ہاتھ پھیرا۔ قلمدان کو ذرا اور قریب کیا۔ مختلف قطوں پر تراشے ہوئے واسطی قلموں کی زبانوں کو انگوٹھے پر دبا کر پرکھا اور رقم طراز ہوا یعنی آئینِ اکبری کے اندراجات کرنے لگا۔

شہر کے محلوں اور گلی کوچوں کی آبادی کے ساتھ ساتھ ظلِ سبحانی نے یہ حکم صادر فرمایا کہ اجناس اور اشیاء کے بیوپاری اپنی اجناس کو پھیری لگا کر آواز اور صدا سے فروخت کریں تاکہ بی بیوں اور گرہستنوں کو اشیائے ضرورت گھر بیٹھے اور اپنی پسند سے مل جائیں۔

ظلِ سبحانی کا یہ سنہری بندوست اب مارکیٹوں، پیوراماؤں اور شاپنگ پلازاؤں

کی چمک دمک کے آگے ماند پڑتا جا رہا ہے۔ میں حقوں کی چلموں، پیندیوں اور چائیوں کو الٹا الٹا کر دیکھتے دیکھتے سوچتی تا کہ گھر کو واپسی میں تاخیر ہو سکے، بازاروں، پلازاؤں اور پنوراماؤں کا کچھ تو فائدہ حاصل ہو سکے۔

اسکیپ کا یہ عالم دراصل مجھ پر عبداللہ کے پنڈ واپس جانے پر طاری ہوا۔ عبداللہ میرا چودہ پندرہ سالہ ملازم تھا، ذہین اور ذمہ دار، سارا کھانا مدد کے بغیر اور خاطر خواہ طور پر نہ صرف تیار کر رکھتا تھا بلکہ ماں کی سی شفقت سے کھلاتا بھی۔ کالج سے واپسی پر وہ مجھے چبوترے کی سیڑھیوں پر بیٹھا ملتا۔ مجھے دیکھتے ہی دروازہ کھولتا، کھانا گرم کرتا، گرم گرم پھلکے ڈالتا، میں ہمیشہ کہتی، عبداللہ پہلے سے پکا کر رکھ لیا کرو۔ مگر وہ بڑی ہمدردی اور محبت سے کہتا باجی تھکی ہوئی تو آتی ہو اور روٹی بھی ٹھنڈی کھاؤ۔ وہ میز پر کھانا لگاتا پھر ہم دونوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ عبداللہ صاف ستھرا اور خاموش طبع بچہ تھا۔ لیکن کھانے کے وقت مجھ سے دلچسپ باتیں کرتا۔ میری طرح وہ بھی علاقے کے پراسرار ماحول میں انوولو (Involve) ہو چکا تھا اور کام کاج سے فارغ ہو کر ایک سراغ رساں کی طرح اس کی آنکھ اور ذہن کام کرتے۔ وہ ہر روز دلچسپ اور چونکا دینے والی خبریں سناتا۔

''باجی آج یہ راز کھلا کہ سامنے والی کوٹھی ہے نا جس میں آنے والی گاڑیوں کی روشنیاں رات بھر ہمیں تنگ کرتی رہتی ہیں۔ اس میں کوئی نہیں رہتا یہ بالکل خالی پڑی رہتی ہے۔''

''جاؤ بھی! اتنی خوبصورت کوٹھی اور گیٹ پر پٹھان چوکیدار اور صبح صبح اسکول جانے والے بچے۔''

''باجی سب فراڈ ہے بچے وچے کوئی نہیں یہ تو دکھاوا ہے۔ یہ تو چوکیدار کے گھر کے بچے صبح صبح بستے گاڑی میں لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور ذرا ہی دیر بعد پچھلی طرف کھیلتے نظر آتے ہیں۔'' کبھی کبھی حیرت کے مارے نوالہ چھوٹ کر پلیٹ میں گر جاتا۔

''باجی دوسرے بنگلے کے ساتھ جو کوڑے کا اتنا اونچا ڈھیر ہے، باجی یہ بھی

چکر ہے۔"

"چل بھاگ۔ چکر کیوں، چکر کا ہے کو ہوتا۔ کوڑا ہے کوڑا۔"

"نہیں باجی مان جایئے۔ اچھا ہاں آج پھر ایک بالکل نئی وگ پڑی ہوئی ہے۔ بازار چلیں گی تو پھر دکھاؤں گا۔" اس کوڑے کے ڈھیر پر ہر دوسرے دن ایک زنانی وگ بڑے قرینے سے دھری نظر آتی تھی۔ عبداللہ پہلی مرتبہ دیکھ کر بڑا حیران ہوتا تھا۔ باجی یہ کیا شہر کی زنانیاں اپنے سارے بال کس طرح اتار دیتی ہیں۔ میں نے اس کو سمجھایا۔ عبداللہ یہ مصنوعی بال ہیں، ان کو وگ کہتے ہیں، عبداللہ روز بروز پکا ہوتا جاتا تھا، اس کا تجسس بڑھتا جاتا تھا۔

ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگا باجی یہ چوکیدار کہتا تھا ہماری مل ہے کپڑے کی، کسی دن اپنی باجی کو لاؤ۔ ہم کپڑا دکھائیں۔ پھر وہ خوفزدہ ہو کر کہنے لگا۔ باجی کپڑا دیکھنے کبھی نہ جانا، باجی اندر کپڑا بھی ہے اور اسلحہ بھی۔

اسلحہ؟

ہاں باجی میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کپڑے کے تھانوں کے نیچے دبا ہوا آتا ہے۔

اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ نہیں نا جاؤ گی! کپڑا دیکھنے نہ جانا۔

عبداللہ تم جانتے ہو مجھے کپڑے کا شوق ہی نہیں۔

اس کو کچھ اطمینان سا ہوگیا۔ باجی میری بات یاد رکھنا۔

اچھا بھئی۔

دو دن بعد جب میں کالج سے واپس آئی تو عبداللہ بستر باندھے بیٹھا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے مجھے کاپی کے ایک سادہ کاغذ پر لکھا ہوا اپنے باپ کا خط دکھایا۔ مجھے جوڑی بخار آتا ہے، فصل کٹائی کے لیے تیار ہے جلدی پہنچو۔

مگر عبداللہ تمہارا باپ تو کارڈ بھیجتا ہے۔ لفافہ کہاں ہے۔

لفافہ نہیں ہے باجی، وہ آنکھیں جھکائے کھڑا تھا۔ مجبوری ہے مجھے آپ چلا